

تذکرہ معاصرین

(1972 اور 1973 کے دوران میں وفات پانے والے ادباء کے حالات اور کلام)

(حصہ دوم)

مالک رام

مکتبہ جامعیہ دہلی

اشتراک

پیش کشی: مجلسِ اعلیٰ فروعِ اسلامیہ دہلی

تذکرہ معاصرین

(1972 اور 1973 کے دوران میں وفات پانے والے ادباء کے حالات اور کلام)

(حصہ دوم)

مالک رام

مکتبہ جامعہ ملیہ

اشتراک

پیشکش کنندہ: قومی ادارہ برائے ادبیات

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سروگرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کئی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلباء کے لیے ”دری کتب“ اور ”معیاری سیریز“ کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ قفل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف کچھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کیا اب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے محمود کوٹوالہ نے اور مکتبہ کی ناؤ کو پھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ پورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر کرنا گزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آئندہ بھی شامل حال رہے گا۔

خالد محمود

چیئرمین ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پروفیسر مختار الدین احمد کی نذر

تعارف

مذکورہ معاصرین کی پہلی جلد ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی تھی اور ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کے پانچ برس کے اموات کا ذکر تھا۔ یہ دوسری جلد ان ادبا کے حالات کو ممتویٰ ہے جنہوں نے ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کے دوران میں رحلت کی۔ ان مرحومین کے حالات جمع کرنے میں سبھی اسی طریقہ کار پر عمل رہا ہے جس کی طرف اپنی جگہ کے شہ رجوع میں اشارہ کر چکا ہوں۔

جن اصحاب سے میرے ذاتی تعلقات لمبے عرصے تک رہے، یا جن کے پس ماندگان اور اصحاب نے دستِ قلموں بڑھایا، آپ کو ان کے حالات مفصل تر اور نسبتاً مستحکم ملیں گے۔ میری دلی خواہش تو یہی رہی کہ سب کے حالات یکساں شرح و بسط سے مہیا ہو جائیں، لیکن اس کی تکمیل محض میری کوشش پر منحصر نہیں تھی، ہر جگہ ضروری تفصیلات ذیل سکیں۔ مجبوراً جو کچھ دستِ آگیا، اسی پر صبر و شکر کرنا پڑا۔ پاکستان کے ادبا کے حالات جمع کرنے میں خاص طور پر دشواری پیش آئی۔ ایک زمانے سے وہاں کے اصحاب سے خط و کتابت کا رستہ بند ہے۔ یہاں ان اصحاب کے دواویں بھی نمایاں ہیں، اور پاکستان سے ان کا حصول جوئے منہر لانے سے کم نہیں، بلکہ وہاں بھی اب یہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے۔ اسی لیے آپ کو ان اصحاب کے حالات میں بعض ایسی تفصیلات نہیں ملیں گی، جن کے دیکھنے کا دوسری جگہ التزام کیا گیا ہے۔ تاہم جو کچھ ہو گیا، یہ بھی ہسا قیمت ہے۔

میں نے یہ حالات برزہ برزہ کر کے جمع کیے ہیں۔ مرحومین کے خاندان کے لوگوں سے

ان کے اصحاب سے، اخباروں، رسالوں سے، کتابوں سے — غرض کہاں تک گفتگوں،
خاصی میں فہرست ہے۔ جتنے زیر گوشہ یا ختم۔ میرے نزدیک ہر ایک حوالے میں کی ضرورت
نہیں، جو اصحاب اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں، میں ان پر بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ وہ
ان کا طریقہ کار ہے، یہ میرا۔ البتہ اگر کوئی صاحب کسی بات کا حوالہ طلب کریں، تو یہ خوشی
پیش بھی کر سکتا ہوں۔

میں ان اصحاب کا شکریہ ادا کر چکا ہوں، جنہوں نے کسی نہ کسی طرح حالات کی فراہمی میں
یا دوا دین میں ہمتا کرنے میں، یا اس جلد کی اشاعت میں دستِ تعاون بڑھایا۔ یہاں اسی
کا اعادہ کرتا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر ان اصحاب کی توجہ شاملِ حال نہ ہوتی، تو یہ
جلد اس شکل میں منظرِ عام پر نہیں آسکتی تھی۔ **فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ**

ملک رام

نئی دہلی ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء

فہرست

بترتیب حروف تہجی

۲۱۹ :	امیر اسنی گنوری، (محمد بخش)
۲۲ :	انیم خیر آبادی، سید امیر احمد
۹۹ :	احد شام حسین، سید :
۱۹۸ :	اختر حیدر آبادی، سردار انجم
۳۸ :	باقی مسدودی، محمد افضل
۲۶ :	بحر و محبوب، راجا محمد امیر احمد خان
۱۸ :	بشیر حیدر آبادی، بشیر النساء بیگم
۲۱۳ :	بلکٹ عظیم آبادی، غلام دستگیر خان
۷۷ :	پنہاں بریلوی، سپہر آر اٹاٹونی
۲۳۵ :	تاب حیدر آبادی، عبداللہ الدین احمد
۶۸ :	تاج قریشی حیدر آبادی، محمد تاج الدین
۹۱ :	تنہا عادی بھٹی پھلواری، سید حیات الحق
۱۹۳ :	ہذب عالمپوری، رائے گوند رائے
۵۶ :	جعفر حسن، (جافر حسن)
۱۵۲ :	حشر سیٹا پوری، سید محمد کاظم
۱۰۱ :	حفیظ ہوشیار پوری، محمد الحفیظ سلیم

- ۱۹۳ : حمید ناگوری، عبدالحمید
- ۱۳۵ : ذاکر حسین فاروقی
- ۱۷۹ : سجاد ظہیر، سید :
- ۲۲۳ : سلام محل شہری، عبدالسلام :
- ۱۸۴ : سید سخی حسن نقوی
- ۱۳۵ : شوکت سبزواری، سید شوکت علی
- ۱۷۰ : ضیاء الدیوبی، ضیا احمد
- ۵۷۱ : ظفر، سراج الدین ظفر
- ۱۳۱ : عادل رشید، محمد منظور الحق
- ۹۳ : عبدالستار بھٹہ لعلی
- ۵۰ : علیم اختر مظفر نگر، محمد عبدالعلیم صدیقی
- ۱۲۰ : فرقت کاکوروی، غلام احمد
-
- ۱۴۹ : گھر گور کھجوری، ایشوری پرشاد
-
- ۸۰ : محمد اسماعیل پانی پتی
- ۱۲۹ : محمد اکرام، شیخ
- ۷۳ : مختار صدیقی، مختار الدین
- ۸۷ : مخفی، صالحہ بیگم
- ۱۴۲ : ممتاز شیرین
-
- ۲۸ : ناصر کاظمی، ناصر رضا
- ۲۲ : یحییٰ اعظمی، محمد یحییٰ
- ۳۳ : یوسف ظفر، محمد یوسف

فہرست

بترتیب تاریخ وفات

نمبر / شخص	محلہ	تاریخ وفات	نمبر
۱۳	۳ جنوری ۱۹۷۲ء	بہمن	۱۳
۳۰	۸ جنوری ۱۹۷۲ء	راولپنڈی	۳۰
۱۸	۲۰ فروری ۱۹۷۲ء	حیدرآباد	۱۸
۲۲	۲۷ فروری ۱۹۷۲ء	اعظم گڑھ	۲۲
۲۸	۲ مارچ ۱۹۷۲ء	لاہور	۲۸
۳۳	۷ مارچ ۱۹۷۲ء	راولپنڈی	۳۳
۳۲	۶ اپریل ۱۹۷۲ء	خیرآباد	۳۲
۵۰	۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء	دلی	۵۰
۵۷	۶ مئی ۱۹۷۲ء	کراچی	۵۷
۶۳	۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء	الآباد	۶۳
۶۸	۵ ستمبر ۱۹۷۲ء	حیدرآباد	۶۸
۷۳	۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء	لاہور	۷۳
۷۷	۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء	کراچی	۷۷
۸۰	۱۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء	لاہور	۸۰
۸۳	۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء	امروہہ	۸۳
۸۷	۲۱ اکتوبر ۱۹۷۲ء	کلکتہ	۸۷
<p>۱۰</p>			

نمبر / تخلص	مقام و محل	تاریخ و محل	صفحہ
تنہا مادی پیمانی پھولادی، حیات الحق	کراچی	۲۷ نومبر ۱۹۷۲ء	۹۱
سید احتشام حسین رضوی	الہ آباد	یکم دسمبر ۱۹۷۲ء	۹۹
حفیظ ہرشیار پوری، عبد الحفیظ سلیم	کراچی	۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء	۱۱۰
فرقت کاکوروی، غلام احمد	منفصلہ	شب ۱۳/۱۴ جنوری ۱۹۷۳ء	۱۳۰
محمد اکرام، شیخ	لاہور	۷ جنوری ۱۹۷۳ء	۱۲۹
ممتاز شیریں	اسلام آباد	۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء	۱۳۲
شوکت بھڑواری، سید شوکت علی	کراچی	۹ مارچ ۱۹۷۳ء	۱۳۵
ڈاکٹر سین فاروقی، ڈاکٹر	بہمن	۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء	۱۳۵
غبرگورد پوری، ابشوری پرشاد	گورد پور	۱۱ جون ۱۹۷۳ء	۱۳۹
حسین پوری، سید محمد کاظم	سیٹاپور	۷ جون ۱۹۷۳ء	۱۵۲
جعفر حسن (جافرسن)	حیدر آباد	۲۵ جون ۱۹۷۳ء	۱۵۹
حمید ناچوری، عبدالحمید	ناچور	۶ جولائی ۱۹۷۳ء	۱۹۳
ضیاء الدینی، ضیاء احمد (پروفیسر)	علی گڑھ	۸ جولائی ۱۹۷۳ء	۱۷۰
سجاد ظہیر، سید	الہ آباد	۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء	۱۷۹
جذبہ چلپوری، راگھو ندر رائے	حیدر آباد	۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء	۱۹۳
اختر حیدر آبادی، سردار بیگم	بنگلور	۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء	۱۹۸
بھرد محبوب، راجا محمد امیر احمد خان	لندن	۱۳ اکتوبر ۱۹۷۳ء	۲۰۱
بگشت عظیم آبادی، غلام دستگیر خان	پٹنہ	۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء	۲۱۳
ابرہمن گنٹوری، احمد بخش	گنٹور	شب ۹/۱۰ نومبر ۱۹۷۳ء	۲۱۹
سلام پھلی فہری، عبدالسلام	نئی دہلی	۱۹ نومبر ۱۹۷۳ء	۲۲۳
تاب حیدر آبادی، عبداللہ بن احمد	حیدر آباد	۲۲ نومبر ۱۹۷۳ء	۲۳۵

عادل رشید، سید محمد منظور الحق

واقعہ کے مشہور شاگرد نوح ناروی کا ایک شعر ہے:

جوانا ہے ان کو تو، اے نوح! آئیں! وہ رستہ، طرف نامہ کچھ نہ پوچھیں
پڑھیں دہل پڑا اور پچھیں سرائتھو! سرائتھو سے نویں رکھیں ہے نارا

یہ جفرانید اور محل و قور انھیں اس لیے بتانا پڑا کہ ایک صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت! یہ نارا کہاں ہے جس کی نسبت سے آپ ناروی کہلاتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں انورا ٹھہرے شاعر کا اور شاہ عزیز ایسے کہ شعر ان کا حکیم کلام تھا، انھوں نے جواب میں یہ شعر کہ دیا۔ سائل کی تسلی ہو گئی۔ خدا کرے کہ آپ کی کہیں ہو جائے اور آپ مجھ سے یہ نہ پوچھنے لگیں کہ تم کون سے اسٹیشن سے ریل پر چڑھیں؟ اور سرائتھو کہاں ہے؟ میں شاعر نہیں ہوں اور نوح صاحب بھی ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو اس دنیا کو پیارے ہو گئے۔ ورنہ کہتلان سے پوچھیے۔

توناہ کا یہ تہفہ اس سے یاد آیا کہ عادل رشید بھی ۲۰ نومبر ۱۹۶۰ء کو اسی ناراہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہاں ان کی نامنویاں تھی۔ ان کے نانا تلامذہ جی یہاں کے بہت بڑے پیر تھے۔ جب یہ پیدا ہوئے ہیں تو ان کے نانا آبا تارک دنیا کر چکے تھے، اور ان کے بیٹے سید شاہ حسام الدین احمد (عادل کے ماموں) سید تجارتی پر رونق افروز تھے۔

عادل رشید کا اصل نام محمد منظور الحق تھا۔ ان کے والد سید شاہ محمد فضل الحق ضلع الہ آباد کی تحصیل سرائتھو کے قصبے رشید متی کے جاگیر دار تھے۔ یہ جاگیر انھیں بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی وہاں وہ اپنے آبائی مکان کڑا مانچور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ بزرگوں میں فضیلت اور طبابت پشتوں تک رہی تھی چنانچہ عادل رشید کے پردادا اور بچر دادا سید شاہ محمد عبد الحق بھی اس علاقے کے مانے ہوئے حکیم تھے۔ دادا نے ان کے پیدا

ہوتے ہی اطلاع کر دیا کہ میں اپنے بچے کو طب کی تعلیم دے دوں گا اور حکیم بناؤں گا۔ لیکن محدث کو کچھ اور منظور تھا۔ دادا ابا کا سال بعد ۱۱۹۲ میں انتقال ہو گیا۔ والد شاہ محمد فضل الحق کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی؛ انھیں اپنی کھیتی باڑی کے علاوہ صرف انھیں چیزوں سے دلچسپی تھی۔ اس سے اس عہد کے دوسرے جاگیرداروں کو دلچسپی تھی اور ان میں کئی طرح کی بازیافت شامل تھیں۔ اس کے برعکس ان کی والدہ ماجدہ (امتہ العظام) پڑھنے لکھنے اور علم و ادب کا ذوق اپنے بچے سے ساتھ لاتی تھیں۔ ان کی بڑی تمنا تھی کہ میرا بیٹا بڑا ہو کر ادیب اور مصنف بنے۔ ان کی تمنا اور دعا پوری ہوئی لیکن افسوس کہ وہ اسے دیکھنے کو زندہ نہ رہیں؛ عادل عرف آکٹوبر ۱۸۶۹ء میں وہ رحلت کر گئیں۔ اس زمانے میں خاندان کا پور میں رہتا تھا۔

۱۱۹۳ میں کانپور میں زوروں کا فساد ہوا تھا۔ شاہ محمد فضل الحق اس سے ڈر گئے۔ انھوں نے مستقبل کے موبوم خطروں سے بچنے کے لیے کانپور سے نقل مکان کر کے آزاد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں ان کے خاندان کے لوگ اپنے محلے دائرۂ شامہ ریف الزماں حکیم یاوشاہ کے گویا مانگ تھے۔ اس محلے میں ریف الزماں لاہوری نام کا ایک دارالطالعہ تھا جس میں مدد کے کئی مشہور رسالے اور جرائد آتے تھے۔ عادل نے اگرچہ علم و ادب کا ذوق اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا، لیکن اس ذوق پر عمل نہیں ہوئی۔ وہ باقاعدگی سے اس لائبریری میں جاتے اور یہاں رسالوں کا مطالعہ کرتے۔ اسی سے بڑھ کر انھیں خود بھی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ "قرض" کے عنوان سے کانپور کے رسالے "مستورات" کے خاص نمبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔

۳۱ افسانے تک وہ سید محمد منور الحق میٹروی تھے۔ عادل تخلص اور رشید میٹروی وطن سے نسبت ادنیٰ ملا بہت۔ لیکن بعد کو دیکھا کہ نسبت کبھی رشید میٹروی چھپ جاتی ہے کبھی رشید میٹروی، تو انھوں نے اسے یکسر ڈال دیا؛ اور عادل رشید بن گئے۔ بعد کے زمانے میں وہ اس نام سے اپنے مشہور مہرے کہ

آج شاید ہی کوئی ان کا اصلی نام محمد منظور الحق جانتا ہو۔ شروع میں وہ بہت دن تک نعت اور توالی لکھتے رہے۔ اس زمانے میں ان کے چند گانوں کے ہزاسٹرس وائس کمپنی نے گرامو فون ریکارڈ بھی تیار کیے تھے۔

۱۹۳۵ء میں وہ والدہ کے سلوک سے، جنہوں نے دوسری شادی کر لی تھی، تنگ آکر گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، حال اُن کہ وہ اس زمانے میں اسلامیہ انٹر کالج میں زیر تعلیم تھے اور اس کی تکمیل کی منزل ہنوز بہت دور تھی۔ وہ پہلے بریلی گئے یہاں اس زمانے میں ایک ماہنامہ ”شاہد“ شائع ہوتا تھا۔ ساحر قدوائی (حال ڈاکٹر ساحر بریلی، لاٹل پور، پاکستان) اس کے مالک اور مدیر تھے۔ عادل رشید اس رسالے میں لازم ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں ساحر صاحب اس رسالے کو ساتھ لے کر وئی آئے، تو عادل بھی ان کے ساتھ یہاں پہنچ گئے۔ یہاں ان کا تین برس کا قیام رہا۔ اسی دوران میں انہوں نے یہاں کے ہفتہ وار پرچے ”جہیل“ کی ادارت بھی کی۔ بالآخر انہوں نے ۱۹۴۱ء میں قسمت آزمائی کرنے کو بمبئی کی راہ لی۔ ادھر ساحر نے دیکھا کہ وہ ”جہیل“ کو نہیں چلا سکتے۔ انہوں نے پرچہ عادل کے سپرد کر دیا، اور خود واپس بریلی چلے گئے۔ عادل بھی پہنچے، تو انہوں نے اُسے ہفتہ وار کر دیا، اور وہیں سے شائع کرنے لگے۔

بمبئی بڑا فقار شہر ہے۔ اگر کسی شخص کو دنیا کمانے کا خاص فن نہیں آتا، تو اس کے بچے بھی اس کامیابی حاصل کرنا محال نہیں، تو بہت مشکل ضرور ہے۔ عادل بھی اس فن سے نا بلند تھے لہذا انہیں بھی ہر طرح کی مشکلات سے گزرنا پڑا جن میں فاسق اور رات کو بازار کی پڑی پر سونا بھی شامل ہے۔

اس زمانے میں یہاں بمبئی میں ایک صاحب تھے سلطان حسین۔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، لیکن کتابیں چھاپنے اور ان کے بیچنے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کا اپنا چھاپہ خانہ (سلطانی پریس) تھا، اس کے علاوہ لکھڑی کا بیوپار بھی تھا۔ غرض بہت کادیتا تاجر تھے۔ عادل کی ان سے دوستی ہو گئی، اور رفتہ رفتہ وہ تجارت میں ان کے شریک

بن گئے۔ انھوں نے ”شاہد“ بھی سلطان حسین صاحب کے حوالے کر دیا۔ اس زمانے میں ”شاہد“ کا دفتر ترقی پسند معنیوں کی تحریک لاکر بن گیا۔ یہی تھے جتنے ادیب و شاعر تھے، وہ عادل کے دوست اور ”شاہد“ کے دفتر کے مستقل حاضر باش تھے۔ سلطان حسین بھی عادل کو بہت مانتے تھے، چنانچہ ان کی رسالت سے بہت سے معتقدوں کو سلطان حسین صاحب سے ملی امداد ملی۔ عادل نے خود بھی کسی زمانے میں ایک انجمن صداقت پسند معنیوں قائم کی تھی۔ وہ اس کے صدر تھے، حیات وارفی اس کے سکتر تھے۔

لیکن جہنی کو کون مال مکتا ہے ۱۹۴۸ء میں حیدرآباد کے خلاف پرمیں آپریشن ہوا۔ خطہ معلوم کس نے سلطان کے خلاف رضا کاروں کی امداد کرنے کا اتہام لگایا۔ پس ”پھر کیا تھا، سلطان حسین گرفتار کر لیے گئے۔ تین دن حوالات میں رہے۔ آخر کار گورنمنٹ چندرا اور عادل و شہدائیں ضمانت پر رہا کر لائے۔ تعقیض پر الزام غلط ثابت ہوا، اور وہ بقیہ صور قرار پائے۔ لیکن اس تین دن کی حوالات نے ان کے اوصاف خطا کر دیے۔ انھوں نے اسے اپنی انتہائی توہین اور ذلت تصور کیا۔ چنانچہ یہی کاسارا جاجا ہایا کاروبار چھوڑ کر راجی چلے گئے۔

سلطان حسین کے کہنے سے جانے کے ساتھ ہی عادل و شہد کا دوبارہیں شروع ہوا۔ ان کا اپنا نام نہ پرچہ نجات اور شہتہاری کہیں جو انھوں نے کسی زمانے میں چلائی تھی، وہ پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ اب ”شاہد“ بھی بند ہو گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کا عزیز ترین دوست ان سے کھینچ گیا۔ ان کے بھلے لوگوں کے تمام دوست بیٹھ دکھا گئے اور کسی نے جھوٹوں بھی ان سے نہ پوچھا کہ بھائی کس حال میں ہو، نوبت نا توں تک پہنچی لیکن آفریں ہے، ان کی ہمت ہر روز پر کر وہ انتہائی مخالف حالات میں بھی اپنے آپ سے مایوس نہیں ہوئے۔

اب انھوں نے نظم کا سہارا لیا۔ ان کے ناول مینہ کی طرح برسنے لگے۔ ہر مینے نیا ناول کس پینے رو دوں گی۔ ان کے کم و بیش فریضہ مونا دل شائع ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ٹالک کی دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ وہ آخر تک اپنے نظم کی کما کی کے سہارا سے عزت و ابرو سے چینے۔

صحت بالعموم ابھی رہی، لیکن آخر کار مسلسل کثرتِ کار نے اپنا اثر دکھایا، کبھی کبھی بیمار بھی

ہو جاتے تھے۔ اسی طرح کی کچھ شکایت محسوس کی، تو علاج کے لیے نانادتی اسپتال (کچی) میں چلے گئے۔ وہیں دس کے دن ۳ جنوری ۱۹۷۲ء صبح کے ۱۱ بجے تین بجے بول کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کیا اور اسی شام جوہر کے قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔

عادل نے ۱۹۴۱ء میں عذرا بیگم سے شادی کی تھی۔ عذرا اہلکار ارشد (حال مدبرِ مہمانسہ الشجاعہ، کراچی) کی بھوپھی زاد بہن ہیں۔ ارشد نقانوی ان کے ماموں تھے؛ شوکت نقانوی بھی رشتے میں ماموں ہوتے تھے۔ اس نیک بیوی نے عادل کا ہر حال میں ساتھ دیا۔ ان کے چھ بچے ہیں اچاریلیاں (ناہید اور نسیم اور نسریں اور شاہینہ تنویر) اور دو بیٹے (جادید اور گلریز)

بشیر حیدر آبادی بشیر النساء بیگم

ان کا خاندان دراصل پنجاب کا رہنے والا تھا وہاں سے لوگ ہجرت کر کے دکن میں جا سکے تھے۔ بشیر کے والد مولوی عبد الرحمن ریاست حیدر آباد (دکن) کے محکمہ سیاسیات میں مدکار (اسسٹنٹ) کے عہدے پر فائز تھے اور والدہ شمس النساء بیگم میرزا صادق علی بیگ آغلہ دار کی بہانہ بی بی تھیں۔ انہوں نے سہانہ کی تعلیم و تربیت اپنی نگرانی میں کی۔ وہ خود اپنی ظہور ستی بیانیہ اور درویشانہ عادات و صفات کے لیے مشہور تھے۔ شمس النساء بیگم نے جو اس ماحول میں تربیت پائی، تو یہی خصوصیات ان کے کردار کا بھی جزو بن گئیں۔ وہ بہت اچلی خوشنویس تھیں اور خطابت میں بھی ان کا مشہور تھا۔

بشیر ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئیں۔ تعلیم سرسربی طور پر ہوئی۔ فادسی کی تحصیل بہت حد تک عملی درجہ کی تھی۔ عربی میں قرآن با معنی، آفیسر کے ساتھ پڑھا تھا۔ اردو اور فارسی شعرا کا کلام تعلیم کے دوران میں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ چونکہ حافظہ معمولی طور پر نہ تھا، اس لیے اس کا بیشتر حصہ یاد میں محفوظ نہ رہا، اور پھر اسی سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ تاہم یہ سلام دہی کے مختلف رسائل ”عصمت“ ”ہمائی“ وغیرہ میں چھپنے لگا۔ شاہیر دکن نے بھی ان کی بہت سوانح لکھی ہیں۔ وہاں کے زمانہ رسائل ”نہایت“ ”بامیہ وغیرہ“ ان کا پورا سا تذکرہ تھا۔ ان کا تذکرہ شمس کے ساتھ شمس دکن کے اسی شغف کے باعث خواجہ حسن نظامی مرحوم (ف ۱۹۵۵ء) نے ”سینت پین آرا“ کا خطاب عطا کیا تھا۔

شروع میں وہ اربابا کشن پرشاد (ف ۱۹۴۶ء) کے درباری شاعر صادق حسین خبار سے شریک ہو کر خبار سے جلد ہی کہہ دیا کہ کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔ ان کے بعد سید علی میر تقی میر (بھابھائی) (ف

۱۹۴۳ء اور اپنے والد کے دوست ابو ظفر عبد الواحد صاحب سے بھی کچھ استفادہ کیا تھا۔

وہ مدتوں ادارۃ ادبیات اردو و حیدرآباد کے شعبۂ نسوان کی نائب مہتمد رہیں۔ ڈاکٹر محمد امین قادری زورِ مرجوم (نومبر ۱۹۶۲ء) کو ان سے ہمیشہ پورا تعارف ملا اور وہ ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں عورتوں کی تعلیم و ترقی میں ان کی مساعی بہت قابلِ قدر تھیں۔

ان کا مجموعہ کلام ۳۲ بیگزینہ اشعار بھی ادارۃ ادبیات اردو (حیدرآباد) کی طرف سے ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس میں مذہب اور اخلاق کا جو مقام تھا، ناممکن تھا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہوں۔ چنانچہ اس مجموعہ میں بھی حمد و نعت پر توجہ، نظمیں ملتی ہیں۔ یوں بھی انھیں نخل کی برہنہ نعت نظم سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس دور کے شاعروں میں وہ اقبال سے بہت متاثر تھیں۔ انھیں بزرگانِ دین سے والہانہ عقیدت تھی؛ اور ان کی بعض مثنویوں کی نظمیں اسی جذبے کی مظہر ہیں۔ نظم کے علاوہ شریعہ کی غامی و دلچسپی تھی۔

۱۹۴۶ء میں مرزا خاسن علی صفوی نازی میر عمارت اور ٹھیکیدار سے نکاح ہوا۔ اتفاق سے وہ بھی ہم مشرب نکلے۔ غازی صاحب کے والد (یعنی بشیر کے خسر بزرگوار) مرزا اکرام علی صفوی بھی شعر کے دسیا اور سخن شناس بزرگ تھے۔ انھوں نے بشیر کے زوقِ شعری کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں گھوڑے پر لٹائیوں سے بیٹھ کر دیا۔ اس سے بشیر نے بہت نائدہ اٹھایا۔ انھوں نے اولادِ جسمانی میں صرف ایک صاحبزادہ (داشد علی صفوی) اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

صوتِ بہت دل خراں بدی۔ اسی میں یکشنبہ ۲۱ فروری ۱۹۷۲ء (۶ محرم ۱۳۹۲ھ) بعدِ مغرب حیدرآباد میں رحلت کی جنازہ اگلے دن ۲۱ فروری کو اٹھا۔ نمازِ جنازہ مسجد شہادۃ (دیرپورہ) میں ادا ہوئی اور انھیں قبرستانِ ملک سیٹھ (متقابلِ پٹہ خانہ محیف) میں سپردِ خاک کیا گیا۔ **وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْہِ وَ أَتَا الْآخِرَیْنَ** ۵ جمر کے لیے ان کے جان نثار شوہر غازی صاحب نے ملک مرزا و رنگ سیاہ کا خوبصورت تعویذ تیار کرایا ہے۔

بہت لوگوں نے تاریخ وفات بھی حکیم محمد نواز شفیق مس عارف (ابوالعلائی آغا) کے قتل کا آخری شعر ہے۔

نوا آئی رضوان سے، عارف! یہی

کہ کہ دو: شکانہ ہے خلدِ بریں

اب کلام کا نوہ دیکھیے، جو آجیگتہ شعر سے اخذ ہے: پہلے در زلفیں میں اور پھر زل کے چند شعر:

نجمِ سحر

نجمِ سحر! تجھے اللہ کی قسم! کس سوچ میں ہے تو کہ بڑھاتا نہیں قدم
چھتے نہیں چپے، ہے اندازِ سوز و غم اس درجہ کیوں اوس ہے، اے پیکرِ الم
تاروں کے قافلے گئے، رخصت ہوا قمر شب زندہ وار ہو گئے، دنیا سے نہ خبر
افسردہ کس کی یاد میں اب تک کھڑے تو؟ ہاں، کن تو تمہات میں ابھا ہوا ہے تو؟

اے نجمِ سحر! تجھے تیرے حال کی

معلوم مجھ کو درجہ ہے تیرے سلال کی

یہ غریب مرگ، جس سے ہے لڑناں تیرا وجود میرے جنونِ عشق میں، ہے خواہشِ نود
تا بلج یہ کائنات ہے، میرے جنون کی بود و نبود میں ہے کششِ کاف و فون کی
تو چاہتا ہے دیکھنا، کیا ہو گا اب یہاں بے انجم و قمر، نظر آئیگا کیا جہاں!
وہ دیکھ کر نہیں آتی میں، کیا دور دورے دنیا چمک اٹھی مشہرِ غلوہ کے نور سے
پھر گرم ہو گی کل کی طرح بزمِ کائنات گردش کرینگے جامِ اجل اسانِ حیات
سورجِ غروب ہو گا تو پھر شام آئیگی تارکِ مات پھر دی جاوے گا تھگی

قائم نظامِ دہر، تنوع کے بل پہ ہے

ثابت قدم رہی ہے روزندہاں، اجل پہ ہے

ربا بے حیا

مورچا بٹاکیں، کہیں نقشِ ثبات ہے ہر موتِ لغو ریزا ربا بے حیات ہے

تو ہر روح محسوس ہے حسنِ دوام کا
دنیا عیسلم کا و حیات و موات ہے
ہر لحظہ ایک عالمِ نو کا ظہور ہے،
معمورۂ جنوں میں ترون پہنچتا ہے
ذوقِ نظر سے باقی ہے یہ حسنِ کائنات
دلِ بارگاہِ تاب و تیر و ابدات ہے
پوشیدہ گونگا ہوں سے ہے دہرِ آفریں
لیکن محیطِ دہر، وہی کیا، عزات ہے
نوئی ہوئی امیدوں کی غمناک داستان
دنیا ئے انبساط کی تاریک رات ہے

انسانے بن رہے ہیں طوطہ و دال کے

صورتِ گرجیات، آلِ حیات ہے

گوشہٴ سنجِ گردشِ دوران نہیں میں ہم
پر کیا کہیں کہ دل ہے کہیں، دور کہیں میں ہم
بیزار اہلِ بزم میں، ساتی ہے بدگماں
مخل میں یوں خشرنگ میں جیسے نہیں میں ہم
نفس میں چین ہے، اے مصغیر! پیٹے دے
فسانہ ہے چمن، ذکرِ آشیان کب تک
گیا ہے دوش، تو فرما بھی آنے والا ہے
زبانِ حال پر اضیٰ کی داستان کب تک
بشیر! زندگی، جاوداں ہے موت کے بعد
یہ جاوداں سہی، لیکن یہ جاوداں کب تک
ہے رات کی سیاہی بھی تمہیدِ صبح کی
غم ہو کہ انبساط، نہیں جسا و داں کوئی
یارب! تو لاج رکھ لے نہیں نیاز کی
ہے تیرے آستان کے سوا آستان کوئی؟
فبت، سنا سنا نا ہے فسانہ دردمند ؟
ذوقِ نفاہ ہو، تو گستاخ میں، بشیر!
ہر شجرِ قابلِ انظار نظر آتا ہے
ہوتی ہے رقت ہی پر اپنے پر ایسے کی تمیز
زندگی گھر گئی، احوالِ پریشاں میں، بشیر!
کہ صبرِ شکر کا ایک نام مجوری بھی بتا ہے
درندہ خواہ بھی غفورِ نظر آتا ہے
ہر بشرِ مکر افکارِ نظر آتا ہے

سیحی اعظمی، محمد یحییٰ

ان کا آبائی وطن قصبہ ہاراج گنج، ضلع مظفر گڑھ تھا، جہاں وہ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً ۱۹۱۹ء میں انہوں نے مقامی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی کی تعلیم اپنے والد مولوی ضیا اللہ سے پائی۔ مولوی صاحب موصوفہ پرانے طرز کے مدرس اور اردو اور فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کی اردو اور فارسی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ سیحی صاحب نے ان کی تعلیم سے پورا استفادہ کیا۔ بلکہ جب زمانہ تعلیم کے دوران ہی میں انہیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا تو کلام بھی والد ہی کو دکھایا۔ انہوں نے حوصلہ افزائی بھی کی اور کلام پر املا بھی لکھی دی۔

۱۹۲۰ء میں ہماری سیاسی تحریک نے یا موڑ دیا تھا۔ غلامتِ تحریک بھی اپنے پوسے شباب پر تھی۔ نوجوان یحییٰ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ دراصل ان کی قومی اور قی شاعری کا منبع یہی سیاسی تحریکوں کا ثابت ہوئی۔

جون ۱۹۲۵ء میں بعض احباب اور بزرگوں کی وساطت سے وہ دارالمصنفین، مظفر گڑھ کے دفتر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق انہوں نے عمر بھر نباہا۔ یہیں کے قیام کے دوران میں انہوں نے پرائیویٹ طور پر دسویں درجے کا انگریزی امتحان بھی پاس کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی باقاعدہ تعلیم کسی درس گاہ کے سرمدنِ منت نہیں تھی۔ اپنے ذہن کے مڈل اسکول کا تعلق بھی برائے نام رہا۔ جیسا کہ خود انہوں نے ایک مرتبہ بتایا تھا، انہوں نے جو کچھ بھی پایا، گھر کی تعلیم سے۔ اردو و فارسی کا زوق ذاتی سفا ہے۔ اردو فاضل بزرگوں اور خفیوں کے فیضِ صحبت اور حسنِ تربیت کا نتیجہ تھا۔

دارالافتخار میں انھیں جو فضا میسر آئی، یہ سراسر علمی اور ادبی تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (ف ۱۹۵۳ء) کی صحبت میں ان کے ذوق شعر نحو کی نے بہت ترقی کی۔ اب وہ برابر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے۔ غالباً ان کی سب سے پہلی نظم ”جو معارف“ میں شائع ہوئی، دو غازی اور شاہ مرحوم رانی افغانستان کے حادثہ قتل (۲۰ نومبر ۱۹۷۳ء) سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ یہ خطاب بملت افغانستان کے عنوان سے معارف کے دسمبر ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کا فارسی ترجمہ افغانستان کے مشہور شہر پشاور کے دوست شاعر سرور خان صاحب نے کیا تھا جو ان کے اپنے جواب کے ساتھ وہاں کے رسالے ”کابل“ کی اشاعت ۶ جنوری ۱۹۷۴ء میں چھپا تھا۔ یہی اعلیٰ۔ ذہن کا جواب فارسی میں لکھا جو معارف کی اشاعت مارچ ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔۔۔

اپنی قوی اور سیاسی شاعری کے باعث وہ قوم پرست بھی نہ رہے۔ معارف کے بلکہ خاصے مقبول تھے۔ چنانچہ ان کے کلام کا مجموعہ ڈاکٹر حسین مرحوم (ف سن ۱۹۶۹ء) کے ایما پر ”نوائے حیات“ کے عنوان سے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے شروع میں مقدمہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں دارالافتخار عظیم گڑھ سے شائع ہوا۔

کلام کا دوسرا مجموعہ نوائے عصر بھی جنوری ۱۹۷۰ء میں عظیم گڑھ سے شائع ہوا۔ اس کے ساتھ پیش فقط ڈاکٹر حسین مرحوم کا ہے۔

یہی اعلیٰ مرحوم شبلی اکوٹ کے شاعر تھے اور ان کے ذوق شعری کی تربیت میں اقبال اکوٹ ہل کا بہت ہاتھ تھا۔ شبلی (ف نومبر ۱۹۱۱ء) اکوٹ ہل (ف نومبر ۱۹۵۵ء) کا جتنا کامیاب اتباع انھوں نے کیا ہے، وہ کسی سے نہ ہو سکا، ان کے دونوں مجموعے اس دعوے پر شاہدِ حافل ہیں۔ انھوں نے رجالِ عصر سے تعلق جو نگیں کہیں ہیں اور ان میں کلام کا جو شکوہ ہے، اس سے ان کی اندر تہذیبِ زبان، فارسی میں درگ، فن کی ہمارت ایک ایک سفر سے نمایاں ہے۔

شاعر کے علاوہ، ذاتی طور پر بھی وہ بہت اچھے انسان تھے، درویش صفت اور سبکدوش

خراج اور سخاوت کا بھرتہ۔ دارالاعتقین کی نوکری سے جو تنخواہ انھیں ملتی تھی، وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کو کبھی مشکل ہی کفایت کرتی ہوگی۔ لیکن اللہ کے اس نیک بندے نے صبر و شکر سے اسی میں ساری عمر بسر کر دی۔

انھیں جگر کی خرابی اور فشارِ دم کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ آخر میں عیسٰی قبول کے دوسے پڑنے لگے۔ اسی میں کوئی دو ہفتے کی علامات کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء چار بجے شام رحلت کی۔ تدفین اگلے دن ۲۳ فردری صبح کے دس بجے ہوئی۔ نماز جنازہ حکیم محمد اسحاق صاحب نے پڑھائی اور اعظم گڑھ شہر کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ اپنے پیچھے جسمانی اولاد میں تین لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑے۔

دیکھا جائے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ خیادی طور پر کبھی غزل کے شاعر نہیں۔ ان کے جوہر نظم میں لکھتے ہیں اور غارِ سسی کی پشکوہ ترکیبوں اور مستِ ذہن کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا ہی کاغذ ہو گا کہ اگر انھیں قصیدہ یا جزئیہ لکھنے کی ضرورت پیش آتی تو اس میدان میں مشکل ہی سے کوئی ان کا حریف ثابت ہو سکتا تھا۔ انھیں زیادہ فہرت اس وجہ سے نہیں مل سکی کہ وہ پراگندے کے ذرائع سے مجتنب رہے۔ لیکن بے اعظم گڑھ کے مقامی اجتماعوں یا مشاعروں میں کہیں شریک ہوتے ہوں، لیکن وہ باہر نہیں جاتے تھے۔ رسائی میں کہی اپنا کام نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم اہل فکر کے حلقے انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مرنے کے طور پر کچھ کلام دیکھیے۔

آہ اقبال

یونہی ہوتے رہیے مشتکِ شام دگر پیدا	نہ ہو گا اب گرا تباں ساما صبرِ پیدا
غلتا تھا جھوکو جو رونہ ازلِ فیضانِ نظرت سے	کہاں ہے پیکرِ خاکی میں وہ سوزِ جگرِ پیدا
نہ اٹھا پھر کوئی رمزِ "انا" کا عارفِ کامل	ہوا تھا ایک تو ہی خود شناس و خودِ پیدا
ترقیابی رہ گیا ذرہ ذرہ خاکِ مشرق کا	قریٰ جو نوائے نے کیا ہے وہ اثرِ پیدا
دیا ہے آبِ دگل کو تو نے وہ دہرِ پریشانی	کیسے ہیں قطرہٴ شبنم نے کہیں اب بالِ پیدا
کیا ملت کو پھرِ فردقِ یقیں سے آشنا تو نے	ترے دم سے ہوئی پھرِ چشمِ باطن میں نظرِ پیدا

ہوئیں تجھ سے نواہے صبح میں کیفیتیں پیدا
دل درد آشنا میں لذتِ آؤ سحر پیدا
نہرتا یا یقیں است غوری، وقفِ خود گاہی کہاں اب رہیں ہوتے ہیں ایسے باخبر پیدا
ہزاروں سال تر گس اپنی بے غوری پر روتی ہے
بڑی شکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ و رو پیدا
علمائے سلف اور علمائے دورِ حاضر

۱۔ ہنگامہ تکفیر

بلادِ تھاک عالم کو شہرِ لا خوف اُن کا
تیمات تھا جہاں جی میں رہنا سرِ بکف ان کا
انہیں شاہانِ شاں تھا وارثِ علمِ نبی کہنا
کہ تھا عشقِ حسن، سرمایہٴ مہر و شرف ان کا
سبق دیتے تھے صلح و فیر کا، افرادِ امت کو
نہیا انگنِ خفا، فیضِ علم و عرفان ہر طرف ان کا
نواہے دولتِ حق لے کے وہ جس دم نکلتے تھے
تو خود کرتا تھا باطلِ غیرِ مقدم نصف ان کا
تیمات ہے، اگر اس دور میں اختلاف کے ہاتھوں
وہ نقدِ سیزہ صد سالہ ہر جاتے تلف ان کا
اب ان کی سندِ ارشادِ پڑوہ توگ بیٹھے ہیں
کہ ہر طرفِ عمل ہے باعثِ ننگِ سلف ان کا
بزرگوں سے ملی تھی جو ستارے بے با، کھوئی
کہاں اب آوازِ سرمایہٴ عزت و شرف ان کا
وہی ہے ابر نیساں، اب بھی معروف گہرا
مگر اب نوٹ لالا سے ہے خالی صدف ان کا
نقطہ لے دے کہ، ہے اک شغلِ تکفیر کا جاری

مسلمانوں کی جانی و دین و ایمان ہیں ہر طرف کا

تھا، دو جہاں کو نون کا مہل سمجھتے ہیں ازل سے ہم بھدا اند دل کو دل سمجھتے ہیں
جمالِ عشق کی نیز نیگیوں کو دیکھنے والے غبارِ تیس کو بھی رُوکشیں محل سمجھتے ہیں
دلِ درد آشنا کیا ہے؟ عطیہٴ فیضِ نظرت کا اُسے دیتے ہیں جس کو جوہرِ قابل سمجھتے ہیں
جبینِ خرق کو مطلوب ہے بس عشقِ پائل کا نشانِ ماسوا کو ہم خطِ باطل سمجھتے ہیں

کہاں موجِ نسیم صبح کی یہ عنبرِ ناشانی

کوئی نقشہ ہم اس میں اور بھی شامل سمجھتے ہیں

کر لیں اب شامِ غم کو ہم رنگیں
رو لیں خوں چشمِ اگبار سے ہم
کیا کھیلگی کبھی یہ دل کی کلی !
خوش ہوں کیا آید بہار سے ہم
لائے ہیں اک بہارِ داغِ جنوں
ایمانِ حسن کے دیار سے ہم
ہر لمحے لذتِ آشنائے نشاط
تلفی جو یہ روزگار سے ہم
لاکھ دھندہ وفانہ جو، پھر بھی
مست ہیں کیفِ اعتبار سے ہم
آپ ہوں غمِ آزمسا تو کبھی
باز آئیں گے جانِ زار سے ہم
دل میں کیا کیا لیے ہوئے اٹھے
آستانِ حریمِ یار سے ہم

ہیں باندازِ شوقِ مست و خراب
لذتِ کیفِ اعتبار سے ہم
لکھنؤ

مے بگڑا لے دو در ملک ! تاکھنؤ بیسنم
بچشمِ آرزو آں موزارِ رنگ و بو بیسنم
خوشا شہرے کہ بر خاکش موادِ غلامی تھند
چہ فرد سے کہ در باغش بہشتِ آئندہ بیسنم
بہارِ موزا ایش دامنِ دل می کشد ایں جا
ز بس ہر سمت جو خوش بسوز و یمنِ نور بیسنم
تو کی گویا چمنِ اندر چین، ہر رگِ زبا شد
تو کی گویا جنتِ اندر عقیقہ ہر کاغذ و کو بیسنم
ہم شہرِ مست آسے موزارِ حسن و رنگینی
بہارِ بسوز دسر و صنوبر چار سو بیسنم
چہ می گویم اچہ کارِ مشکلی اندر نگاہم ہا
چوں ہر جانب بجوم شاہانِ لالہ و بیسنم
بے زبدا اگر ایں شہرِ دارِ شکب ارم خوانم
کہ خاکِ عبرتِ منش را سرا پا رنگ و بو بیسنم

تکھنم سیرِ دروا، از بہارستانِ رنگینش
ہنوزم آمد ز باد شد کہ دیگر لکھنؤ بیسنم

ڈاکٹرِ رادھا کرشنن

وہ فاضلِ یگانہ و دانشورِ عظیم
رہنمائی ہے جس سے ہر شرق و غرب میں نام ہند
خاکِ وطن کا مایہ سدا نازِ فلسفی
چے جس کے دم سے رہنمائی اور نجاتِ ہند
وہ جس کے فیضِ فلسفہ و علم و فہم سے
دانشورِ انِ عصر میں ہے امتِ سرا ہم ہند

وہ جس کے دستِ بن نے سنوارا ہے مرقوں روئے نکلا بر صبحِ وطنِ از دلِ شامِ ہند
 وہ جس کی موجِ حکمتِ تحقیق و نسکو ہے ہر در میں رہا ہے معطرِ شامِ ہند
 جس کا کمالِ علم، ہے رشکِ حیا لہِ عصر جس کا جمالِ فکر ہے غرِ غفلتِ رامِ ہند
 جس کی حیاتِ خدمتِ ملت کا نذر ہے ہے جس کی ذاتِ مرجعِ اہلِ دواں ہند
 تبریکِ تجھ کو وقت کی جہدِ ریت، اگر آج اک فلسفی ہے صدرِ نشینِ نظامِ ہند

وہ صدر! جس سے دہریں ہے غفلتِ وطن

جس کا شعار ہے ادب و خدمتِ وطن

ناصر کاظمی، ناصر رضا

اگرچہ کچھ مورد وثق زمینداری بھی تھی، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے خاندان میں سپاہگری اور فوج کی لازمت پشتوں سے چلی آتی تھی۔ چنانچہ ان کے والد محمد سلطان بھی فوج میں صوبیدار بھرتے۔ بزرگوں کا دین اپنا ارشہر تھا، اور یہیں ناصر صاحبہ دسمبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم ایف اے تک باپ ہی سے کی گئی، دسویں درجے تک اپنے وطن میں اور انٹر میڈیٹ کا لیول لاہور میں۔ بی اے میں تعلیم پارسہ تھے کہ برصغیر متوان دینے سے پہلے ہی پڑھائی چھوڑ دیا، واپس اپنا لے چلے گئے۔ یہاں دو ڈیپارٹمنٹس میں نوکری کا کام دیتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں لاہور چلے گئے اور اس کے بعد ان شہر کو اپنا وطن بنا لیا۔ کچھ عرصے تک ایک نیم سرکاری دفتر میں نوکری کی تھی۔ لیکن ان کا سراج ادبی تھا۔ یہاں وہ لکھنے لگے۔ چنانچہ سال بھر بعد اوراقِ فن ماہنامے کے ادارت تحریر میں شامل ہو گئے۔ تین برس تک یہاں کام کیا اور ۱۹۵۲ء میں شہر رسالے بانیوں کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پھر آخر تک یہیں رہے۔

انہوں نے شاعری طابع علمی کے زمانے میں شروع کی تھی۔ اس دور میں ان پر میر اور فی کا گہرا اثر تھا۔ لیکن ۱۹۴۶ء میں جب دوسرا دور شروع ہوا، تو وہ نانی کے پھل سے آزاد ہو گئے۔ اب انہوں نے مفیظ ہر مشہور پروری سے اپنے کلام پر اصلاح دینا بھی شروع کی۔

۱۹۵۵ء کے لگ بھگ انہوں نے غزل میں وہ رنگ اختیار کیا جو سلسل غزل اور نظم سے قریب تر تھا۔ اب خیالات میں پختگی آگئی تھی یہی اسلوب آخر تک قائم رہا۔ وہ میر کے

کامیاب قبیح کہے جاسکتے ہیں۔ وہی جذباتی و صیحات اور کھک اور سپردگی کا ہجر اور انداز جو میر کی خصوصیت ہے۔ لیکن اس میں بھی انہوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکال لی تھی۔ میر کے علاوہ ان پر ہندی شاعری کا مخصوص مد ہے کا بھی نمایاں اثر تھا۔

ان کے کلام کا انتخاب برگ نے ا کے عنوان سے پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ابتدائی زمانے کے چند شعروں کے علاوہ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۲ء کا کلام شامل تھا۔ چھپ کر دوسری مرتبہ (۱۹۵۷ء میں) شائع ہوئی۔ تو اس میں ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۷ء کا انتخاب بھی اضافہ کر دیا گیا۔ وفات کے سال بھر بعد دوسرا مجموعہ کلام دیوان کے عنوان سے شائع ہوا۔ تیسرا پہلا شمارہ ۱۹۷۵ء میں چھپا۔ اس میں بیشتر مسلسل غزلیں ہیں۔

۱۹۷۳ء کو لاہور میں انتقال ہو گیا، اور ان کے ساتھ اردو کا ایک پختہ کار ادبیت کا پایندر، و نعت داری کا دلدارہ شاعر م سے جدا ہو گیا۔

اب کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو :

ہوتی ہے تیرے نام سے دشت کبھی کبھی	برم ہوتی ہے یوں ہی طبیعت کبھی کبھی
اے دل! کسے نصیب یہ توفیقِ اضطراب!	مٹی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی
اے دوست! ہم نے ترکِ محبت کیا جو	محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی
پُرسان نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں	ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی
دورِ خزاں میں یوں مرے دل کو قرار ہے	میں جیسے آشنا کے بہاراں نہ تھا کبھی
کیا دن تھا جب جن میں خزاں بھی بہا رہی	یوں اپنا گویا میں دیوان نہ تھا کبھی
یہ کیف وہ بے نشاط نہ تھی اس قدر حیا	جینا اگر ہے عشق میں آساں نہ تھا کبھی
اس پیکرِ ناز کا فسانہ	دل ہوش میں آئے، تو سنا ہے

جزرِ شکر کو رم نے زباں سے کچھ نہ کہا	یہ اور بات کہ پوچھا نہ اہلِ دنیا نے
تیرے جلوں میں دل کا پ کا پ تھا ہے	مرے خزان کو آسودگی بھی راس نہیں
بھن کیا شامِ ملاقات آئی	سب پہ شکل سے تیری بات آئی
بچ سے چپ نہیں تیرے ہجرِ نصیب	اے، کیا ہو گا، اگر رات آئی

نازیر گلائی میں کیا کچھ تھا حسن کی سادگی میں کیا کچھ تھا

کتنے بیٹھے دنوں کی یاد آئی آج تیری محو میں کیا کچھ تھا

راز پریشانی بھی کرے ، تو کیا حاصل کتیرا غم فلم سبیل دیا بھی تو نہیں

تو ہی بتا، ترے بے خانہاں کدھر جاتیں کر راہ میں شجر سایہ دار بھی تو نہیں

ختم زندگی ، نہ دردِ فراق دل میں یوں ہی سی ہے طلب کوئی

دیکھتے دیکھتے ، رول کا سفر ختم ہوا سو گیا چاند مگر غیند نہ آئی مجھ کو

سایہ کی طرح مرے ساتھ ہے رنگِ عالم گردشِ وقت کہیں اس نہ آئی مجھ کو

کتنے شوریدہ مرتعہ پروائے شام جوتے ہی جل مرے کچھ تو

ایسا مشکل نہیں ترا ملتا دل ٹو جتو کرے کچھ تو

ترے خیال سے نو دے امنی ہے تنہائی شبِ فراق ہے دیاتیری جیہ لوہ آرائی

یہ سانچہ بھی محبت میں با رہا گذرا کہ اس نے حال بھی پوچھا، تو آنکھ بھرائی

دلِ نسوڑے میں پھر دھوکنوں کا شور اٹھا یہ بیٹھے بیٹھے مجھے کن دنوں کی یاد آئی

میں سوتے سوتے کتنی بار چونک چوٹک پڑا تمام رات ترے پہلوؤں سے آج آئی

پھر اس کی یاد میں دل بیقرار ہے ، نامہرا بچھڑ کے جس سے مہر کی شہرِ شہرِ سوائی

حالِ دل ہم بھی سناتے ، لیکن جب وہ نصرت ہوا تب یاد آیا

دن گزارا تھا بڑی مشکل سے پھر ترادعدۂ شب یاد آیا

تیرا سہولا ہوا پسوانِ وفا نر رہیجے اگر اب یاد آیا

بگولے یوں اٹسے پھرتے ہیں خشک جھل میں تلاشِ آب میں پیسے غلظتِ آلودہ

ندانہ دن نہ دکھائے تجھے کہ میری طرح مری وفا پہ سحر و سہ نہ کر سکے تو بھی

تجھے یہ غم کہ مری زندگی کا کبیا ہو گا ! مجھے یہ جند کہ مراد نہ کر سکے تو بھی

وجہ تو کیسے بھی ہے غیاں اس کا حد سے بڑھ دیا ، تجھے تو نرا کیا ہے

زندگی جس کے دم سے ہے نامہرا یا اس کی حذابِ جاں میں ہے

کچھ تو کہتی ہیں چٹک کر کلیاں کیا سناتی ہے صب فود سے سن

گل بھی ہے ایک نوا غور سے سن	نگہ کی منت کشو آواز نہیں
نغمہ ہے نغمہ خفا، غور سے سن	خاموشی حاصل مریدتی ہے
جرس دل کی صدا غور سے سن	ہر قدم راو طلب میں، ناصر!
اپنا بھی نہ خیر خواہ رہنا	ناصر! یہ وفا نہیں، جنوں ہے
تیرا غم بھی جہاں نے چین لیا	تیرا منہ تو خیر، مشکل تھا
نچنے نچنے کو صبا چاہتی ہے	اک ہیں بارہین ہیں، دور نہ
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے!	کچھ تو احساس زیاں تھا پہلے
اس میں اندیشہ جان تھا پہلے	یہ انگ بات کہ غم ماس ہے اب
اس قدر دور کہاں تھا پہلے!	اب بھی تو پاس نہیں ہے، لیکن
اس کی صورت بھی اپنے گھر سے ہے	کیوں نہ کہینچو دنوں کو دروازہ
اس رسم در او ہمدردی کو حس گئے	راس عجب نو میں قدر مستعار وفا نہیں
جی شست ہے کما ہوا چین کو ترس گئے	منزل کی ٹھنڈ کوں نے ہوس رو کر دیا
غریب جیس کا راستہ دیکھا	اُس نے منزل پہ لاکے چھوڑ دیا
دو چارہ گر گرہ گلشن مجاہدانہ لگے	جو گھوڑا لگے، ان کا نہ رہی، سپاہی سے!
نیت تو خیر آہی جباہتگی	اس کے آنے کی کچھ کہو، یا ردا
بھر کی رات ڈھل ہی جاتیگی	منہ پیٹنے پڑے رہو، ناصر!
آفر ساری دنیا ہے تیرے ہاتھ روٹھ گئے	ہم نے تجھ کو لاکھ بکارا، تو لیکن خاموش رہا
میں نہ سمجھا، تیرا بیغام آیا	کوئی جھوٹا جو سرِ شام آیا
دور رہ کر بھی وہی کام آیا	زندگی اس کے قصور میں کتنی
پڑے چوتے ہیں بعنوان سبزہ بیکار	نہ بھول جھڑتے ہیں ہم پر اند برق گر تھی ہے
یہ گھر اسی چراغ سے آباد ہوا، تو ہو	اب دل میں کیا رہا ہے! نری یاد ہو تو ہو
ٹٹنے والے بچڑ بچڑ کے ٹٹے۔	ایک تم ہی نہ مل سکے، دور نہ
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے عواہل ہو	یہ کیا کہ ایک طور سے گزر رہے تمام گھر

ہر شے بھارتی ہے پس پردہ محکوت لیکن کسے خاتون کوئی ہمنوا بھی ہو
 عمر بھر کی نواگری کا مسئلہ اے خدا کوئی ہمنوا ہی دے
 زرد رُو میں ورق خیالوں کے اے شبِ ہجر اکچہ سیاہی دے
 آج دیکھا ہے جھم کو در کے بعد آج کا دل گزندہ جاتے کہیں
 آرزو ہے کہ تو یہاں آئے اور پھر عمر بھر نہ جاتے کہیں
 ہمارے گھر کی دیواروں پہ نامہ مرا ادا سی بال کھولے سو رہی ہے
 اک نیا دور جنم لیتا ہے ایک تہذیب فنا ہوتی ہے
 اب جی میں ہے کہ مگر سی پتر سے پھولے ممکن ہے قلب سنگ سے نکلے کوئی پری
 شور برپا ہے غارتہ دل میں کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
 بھری دنیا میں جی نہیں لگتا جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
 وقت اچھا ہی آئیگا نامہ مرا خم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی
 یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں پھر کبیں ہر دل کے تقدیر میں نہیں تنہائی
 رات بھر جاگتے رہتے ہو سبلا کیوں نامہ مرا تم نے یہ دولت بیدار کہاں سے پائی
 زندگی بھر دنیا میں سے ہوتی بچ بچا رو! خطا میں سے ہوتی
 سنم نامہ روا تجھی سے ہوا تیرے حتی میں دعا میں سے ہوتی
 ہاتھ زخمی ہیں تو پتکوں سے گل مثل اٹھا پھول تیرے ہیں نہ میرے باغ کس کا پتہ پوچھ
 کہیں ملا، تو کسی دن منا ہی لیکن اے وہ نندہ ربخہ کی، پھر کبیں یارا پنا ہے
 مری خوش بھلاہوں کو چشم کم سے نہ دیکھ میں رو پڑا تو دلوں کے طبق ہلا دنگا
 زباں سخن کی، سخن بانگین کو ترسیگا سخن کردہ مری طرز سخن کو ترسیگا۔
 کہتے ہیں، نزل تانیہ پیمائی ہے نامہ مرا یہ تانیہ پیمائی زرا کر کے تو دیکھو

یوسف ظفر، محمد یوسف

یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو کوہ مری (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ غلام رسول کامیاب سما جرتھے اور ان کا عہدہ شہر میں شمار ہوتا تھا۔ وہ شعر بھی کہتے تھے۔ گویا ظفر صاحب کو شاعری بھی دہلے میں لی

یہ ابھی زیر تعلیم تھے کہ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۹ء میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مزید المیہ یہ ہوا کہ ظفر سے بڑی ایک بہن تھیں، جو والد کی وفات کے وقت پاس کٹری تھیں! وہ یہ صد مبرداشت ذکر سکیں، باپ کی لاش دیکھ کر ان کے دل کی حرکت بھی بند ہو گئی۔ یوں گھر سے ایک وقت دو دو جنازے نکلے۔

ظفر صاحب اس وقت ساتویں درجے میں زیر تعلیم تھے۔ پندرہ برس کی عمر اور دایسے شدید صدمے! غریب کی دنیا تاریک ہو گئی۔ سخت جذبات نے شعر کی صورت اختیار کر لی۔ انھوں نے اپنی پہلی نظم اسی موقع پر کہی جو گویا مرنیہ تھی۔

۱۹۳۶ء میں بی اے پاس کیا اور اگلے برس ۱۹۳۷ء میں تلافی روزگار میں دلی پہنچے۔ اسی زمانے میں جوش ملیح آبادی نے پنڈت برادرز کی سرپرستی میں ماہنامہ ”یہلم“ جاری کیا تھا۔ ظفر کی ان سے ملاقات ہو گئی۔ یہ بہت پریشان حال تھے۔ پوری کوشش کے باوجود انھیں کہیں کوئی کام نہیں ملا تھا۔ انھوں نے پیروزگاری کے ایام میں دیواروں پر شہ پار چسپاں کرنے تک کا کام کیا تھا اور اس کی اجرت سے پیٹ بھر نے کوروی کافی تھی۔ جوش نے انھیں کلیم کی مقبری کی پیشکش کی۔ لیکن یہاں بھوک کی چند ماہ بعد وہ مستعفی ہو کر لاہور واپس چلے گئے۔ یہاں انھوں نے محکمہ تنہار میں کمر کی اختیار کر لی۔ اس دفتر میں پانچ

برس ہے۔ ۱۹۴۳ء میں میاں بشیر احمد (مدیر ہمارا) نے انھیں اپنے یہاں بلا لیا۔ یہ زمانہ ان کا نسبتاً اطمینان اور فن کے پہلو سے کامیاب گذرا۔ لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کا علم ہوا اور انھیں شاعر کی حیثیت سے شہرت بھی ملی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ریڈیو پاکستان میں ملازمت لی گئی اور وہ اس میں شملک ہو کر اولپنڈی چلے گئے۔ ۱۹۴۶ء مارچ ۲۹ء بوقت شب اولپنڈی ہی میں انتقال ہوا۔

صغر ہی میں حساس طبیعت کے انسان تھے۔ اگرچہ وہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے، لیکن والد کی طویل ملازمت نے نہ صرف ان کا کاروبار تباہ کر دیا، بلکہ علاج معالجے نے اندوختہ بھی ختم کر دیا۔ ان کی وفات کے بعد اپنی اور گھربار کی ذمہ داری ان کے کمزور کندھوں پر آپڑی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں غری ویاں کا لہجہ بہت نمایاں ہے۔

شروع میں نثر لکھتے تھے، تعلیم سے تعلق کے زمانے میں جوش کے زیر اثر نظم لکھنے لگے۔ لاہور گئے تو احسان دانش اور میراج کی سمیت میں۔ رنگسنہ ہو گیا۔ آخری دو ایک سال میں پھر نثر کی طرف مائل ہو گئے تھے، لیکن اس میں شہ نہیں کہ ان کے جوہر نثر کی بجائے نظم میں زیادہ کھلتے ہیں۔ اس میں ان پر اختر شیرانی اور فیض کا کافی اثر تھا۔ آخری زمانے میں نعت پر بھی غصہ ہو رہی۔

وہ پُرگو تو نہیں کہے جاسکتے، لیکن چند زود گو ضرور تھے۔ "زندگیاں اور زہر خندہ" دو مجموعے تقسیم ملک سے پہلے شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد کے کلام کا کوئی مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ زہر خندہ سے کچھ نثروں کا انتخاب چشم خدمت ہے، ان کے کلام میں آزادہ روی اور عقیدت تبصر کا صغر نمایاں ہے۔

شعر و شاعری

سوچنا یوں تو سہلا ہے، مگر ایسی کیا سوچ
جس سے بیدار نہ ہو جو ہر ذاتی اپنا
بچ ہے غیر متعلق و متعلق کا خیال
جمہ کو کیا اس سے کہ شعر دل میں ملاؤ تو نظر

ہے وہی جو مجھے مستاد کرے دنیا میں
 کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
 اس زمانے چاہیے کہ جس سے اب تک
 دھیرے دھیرے مرے ہمعصر چلے جاتے ہیں؟
 کیا مجھے شہرت و عزت کے لیے جیسا ہے؟
 داخلِ نرسن ترنم بھی ہے شاعر کے لیے؟
 غرور آنورہ جبین اور گریباں ہمد چاک
 شاعری کے لیے کیا یہ بھی ہنس روئی ہوگا؟
 اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں
 یہ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ نہیں ہو سکتا
 میں ماری تو نہیں ہوں کہ پشاری لے کر
 کیسل دکھلا تا پھروں شعبہ بازو کی طرح
 میں تو خود اپنا پیمر بڑوں کو میرے نئے
 میرے احساس کی تصویر ہوا کرتے ہیں
 میرے شعلے تو مری روح کی آوازیں ہیں
 کتنی گنظر فی نظر ت ہے مری سوچ کر میں
 اپنے اشعار کو لوگوں کی نظر سے دیکھوں
 نا علاتن، نعلاتن سے غرض کیا مجھ کو
 تافیر کیا، مری تخیل کو کوئی طاقت
 پا بولاں نہیں کر سکتی غلاموں کی طرح

کون کہتا ہے کہ اشعار ہیں میرے الفاظ
 یہ تو اک خام خیالی ہے جہاں دانوں کی

میں توجہ منتا ہوں نظروں سے تری کہتا ہوں
یہ الگ بات ہے مفعول، فعول، فعولن، فعلن
یا فعولن، فعلا تن میں بیاں ہو جاتے

قیدی

کوئی زنجیر گراں قید نہیں کر سکتی
سنگ و آہن کی بنائی ہوئی کوئی دیوار
تجھ کو خوش میں تا دیر نہیں رکھ سکتی
تیری فریاد ہے زنجیر گراں کی فریاد
تیری دیوار میں پتھر کی نہیں سنگینی
تیرے دردِ فانی میں مجھے رکھ سکتی ملائیں ہی کہاں

ایک آسودہ اوہام، طلسمِ حجابِ سد
تجھ کو پابند کیے دیتا ہے، تو قید نہیں
تو ہے آزاد کہ آزادِ شب و روز ہے تو

۲

یوں تو پابند میں ہر حال میں الہائے بخش
آدمی کے لیے کیا قیدِ عرصہ کریم ہے!
ایک ہی گردشِ ایام کے حسبِ قید کی
سانس ہی وقفہ زنجیر سے کچھ کم تو نہیں
زندگی دیدہ و بینا کہ ہے اک جسِ دہام
تو نے زنجیرِ تختل کی سنی ہے جھنکار
تیری زنجیر کی آواز سے کچھ کم تو نہیں
حیرتِ شبانہ شب و روز کا بیانا ہے
آنکھیں مل سکتی ہیں لبِ بند ہی ہو سکتے ہیں

پرتجھ کوئی گرفتار نہیں کر سکتا
تو ہے آزاد۔ کہ آزادِ شب و رونہ ہے تو

۲

سکر پھیل کی دیواروں میں رونے والے!
تو ہے آزاد۔ نہرا سوچ کہ آزاد ہے تو

تیری دیوار تو پتھر کی ہے۔ بیخس دیوار

جو مرے سامنے اک سایہ بمعنی ہے

لیکن افکار کی دیوار ہے سیری دیوار
جس کو میرے ہی تخیل نے بنایا ہے ہنگر
کوئی طاقت اسے مسمار نہیں کر سکتی

سمر راہے

راہ پر چلتے ہوئے دل میں خیال آتا ہے

ہر قدم بھر کر لیے جاتا ہے منزل کے قریب

میں بھی اپنے شبستان میں پہنچ جاؤنگا

بھول جاؤنگا کہ یہ دن بھی کٹا مر مر کے

اور ناقوں کی ہلاکت میں کبھی تلواریں

میری ہر رنگ میں لہو بن کے چلتی ہی رہیں

بھول جاؤنگا کہ گزرتی تھی سانسوں نے

وقت کا ایک چراغ اور بجھا ڈالا ہے

زندگی سکڑی میں ڈھلتی رہی، ڈھلتی ہی رہی

نفسہ شعر، محبت کے ہزاروں دفتر

پیٹ کی آگ میں جلتے تھے، مجبور تھامیں

سینکڑوں سایہ ابھرتے تھے نظروں میں ہی

اور اب ایک ہی سایہ مرا ہوا ہی ہے
ایک ہی سایہ مرے ذہن میں لرزاں ہے کہیں
موت سے کتنا قریں ہوتا چلا جاتا ہوں

ہر قدم گھر کو لیے جاتا ہے منزل کے قریب
میں ابھی اپنے بشتوں میں پہنچ جاؤں گا

غزل (غوی اعتبار سے)

کہو! اک بات کہوں، کوئی سنیگا تو نہیں
تم سونگی! ارے! ہاں تم تو سونگی، لیکن
سوچ لو، سن کے بُرا تو نہیں مانو گی ارے
تم بُرا مانو گی۔ میں جانتا ہوں، جانتا ہوں

خیر تو آؤ، سنو، آؤ۔ قریب آ جاؤ

کوئی آ جا سیکگا؟۔ آئیگا، تو پھر کیا ہو گا!

پھر سی، پھر سی، جاؤ کوئی آ جا سیکگا

اب کہوں؟ سوچ لو، میں تم سے کہہ دیتا ہوں

نہیں مانو گی؟ نہیں مانو گی تم! ہاں بھی جاؤ

کیوں مجھے اپنی قسم دیتی ہو۔ شہر و شہر و

چھیڑتا ہوں؟ تمہیں میں چھیڑتا ہوں؟ خوب چہ خراب!

اچھا تو آؤ، سنو۔ تم تو نہیں مانو گی

مانو گی؟ اچھا، کہے دیتا ہوں، میں نے کل رات

دل میں سوچا تھا کہ اب تم سے نہیں بولوں گا

بھوک

بھوک زندہ رہے۔ تاثرِ نغمہا زندہ رہے

کوئی آسورۂ آلام نہ ہونے پاتے

کوئی آرام سے، بیٹھ کر نہ ہونے پاتے

اس کی عظمت رُخِ ایام پتہ تابندہ رہے۔

بھوک زندہ ہی رہے، جس کی حرارت کے سبب

آنکھیں کھل جاتی ہیں، ماحول بدل جاتا ہے

دل سے توغیر کا احساس نکل جاتا ہے

پیدا ہو جاتے ہیں سب نگرِ معیشت کے سبب

بھڑ بھڑے پھرے ہوتے پھرتے ہیں انسانوں میں

جن کی پہچان اسی بھوک سے ہو جاتی ہے

آرزو خوارِ شرافت کے چھو جاتی ہے

اور پیوندِ نظر آنے میں دامانوں میں

بھوک مٹ جائے، تو یہ تیری محبت کی نظر

دو ہی دن میں خطِ بیہکا نظر آنے لگے

ہم میں شامل کوئی دہرا نظر آنے لگے

میرے چہرے پہ بکھر جائے شکایت کی نظر

بھوک زندہ ہے تو احساس بھی تابندہ ہے

آرزو میری، تیرا پیہم طلب، بھوک ہے، بیکو!

بھوک ہے سید نہ سوزاں میں جو اک بھوک ہے، دیکھو!

بھوک سے میں ہی نہیں، تو میں تو تابندہ ہے۔

باقی صدیقی، محمد افضل

راولپنڈی (پاکستان) سے کوئی تین میل کے فاصلے پر ایک شہر سائبہ نامی ہے، وہیں ۱۲ دسمبر ۱۹۰۹ء کو پیدا ہوئے۔ اگرچہ پینانڈان قریشی تھا لیکن باقی نے صدیقی نسبت کو ترجیح دی۔ اسی اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اسی موتِ تعلیم دسویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ کم عمری میں تلاشِ روزگار میں سرگرداں ہونا پڑا اور کہاں کہاں کے کونوں نہیں جھانکے! پانچ سال تک رہا تاقی مدرس میں بچوں کو پڑھاتے رہے جب بالکل عاجز آ گئے، تو قسمت آزمائی کو بھی پیچھے کو شاید نظم میں کچھ کام لے تین برس یہاں رہے۔ دو ایک جگہ کام کیا لیکن کوئی مستقل صحت نہ ہو سکی۔ اتنے میں دوسری جنگِ عظیم پھڑپھڑی، تو فوج میں حوالدار کرک بھرتی ہو گئے۔ دو سال بعد جنگ ختم ہوئی، تو اب بعض اور فوجی حکموں میں ملازمت کی گئی۔ لیکن ۲۱۹۴۹ میں والدہ کی وفات نے یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا، وہ استعفا دے کر گھر آ گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ادبی محاذ پر کوشش شروع کی۔ شروع میں چند سے راولپنڈی کے ہفتہ وار ”راہِ منزل“ میں ملازم رہے۔ سال بھر بعد ۱۹۵۱ء میں ریڈیو میں بگڑی گئی رہاں بھی منسلک در سال کام کیا تھا کہ تحفیف میں الگ ہونا پڑا۔

آغازِ مرگوتی میں چند سے سید عبدالحمید عدم سے اصلاح لی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے لادائی پن کے باعث یہ سلسلہ دیر پائانیت نہ ہوا۔ کلام کے چہ نمونے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱) جامع جم؛ (۲) دارِ دکن؛ (۳) از ہم جاو؛ (۴) بارِ سفر؛ (۵) شاخِ تنہا؛ (۶) از بسفر۔ آخری میں نعتیہ کلام ہے۔ وہ پنجابی میں بھی کہتے تھے۔ اس کا مجموعہ ”کچے گھڑے“ کے

عنوان سے چھپ چکا ہے ۔

۸ جنوری ۱۹۵۲ء میں راولپنڈی میں رحلت کی ۔

چونکہ زندگی میں کبھی آسودگی نصیب نہیں ہوئی اس لیے ان کے کلام میں درد و سو ز کی فراوانی ہے ۔ اس پر تکیے چمن اور طنز نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا ہے چند شعرلاحظہ ہوں :

شرابِ ناب کشتی مری رواں تھی کبھی	کچھ اس طرح تری رمت - فیمنوں تھی کبھی
ترے شگفتہ شگفتہ نقوش پا کے طفیصل	مری نگاہ میں ہر راہ کہکشاں تھی کبھی
چمن چمن مری وحشت کا آشیانہ تھا	کلی کلی مری خوشبو سے گلستاں تھی کبھی
مری نگاہ سے تیرا غرور روشن تھا	تری نگاہ سے دنیا مری جو ان تھی کبھی
جہان کفر و محبت میں میری بیٹابی	توہنا کا ناز تھا ، اور زندگی کی جاں تھی کبھی
گھر جہاں جو محیط حیات ہے ، تو کیا	مری حیات جو محیط ظہم جہاں تھی کبھی
تجھے گلا ہے مری جان ناتواں سے مگر	ترا سہارا ہی جاں ناتواں تھی کبھی

کبھی کہیں مجھے ، باقی ! خیال آتا ہے

وہاں نہیں ہے مری زندگی جہاں تھی کبھی

نہ ترا ڈھیتا وہی دوستی پر	اس بارغ میں تھا مرا آشیانہ
ہی جہاں تھا وہی گردش جہاں تھی کبھی	وہ ہر باں تھے تو : چیز مہراں تھی کبھی
زندگانی کا سب مزہ ، باقی !	مختصر سے فریب کما : نے پر
کہہ رہی ہیں حضور کی باتیں	ختم ہونے پہ ہیں طلاق تیں
کس کی راتیں کہاں کی برساتیں	آپ کے ساتھ تھیں وہ بیاہیں
کچھ اس انداز سے اس نقشہ پر درک لایا گیا	نہ دنیا میرے کام آئی ، نہ میں دنیا کے کام آیا
آپ کی ، یا جہاں کی بات کریں	کون سے مہربان کی بات کریں
ہر یکس اُس جہاں کی باتیں	اب کوئی اس جہاں کی بات کریں
ہرے کوٹن سے سینکڑوں باتیں ہوتیں مگر	جس بات کا گلا تھا ، وہی بات رہ گئی

اشیم خیر آبادی، سید امیر احمد

تتارخین میں سید محمد مسکری ترمذی دسیم خیر آبادی کا نام ایسا غیر معروف نہیں کہ کسی تعارف کا محتاج ہو۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت، سید حسین امیر خلیفہ امام چہارم زین العابدینؑ سے منسلک ہے۔ سید حسین امیر کے خاندان کے ایک صاحب سید علی مدینہ سے ہجرت کر کے ترمذ اور پاکستان میں جا بسے تھے۔ ایک روایت ہے کہ ان کی اولاد میں سید احمد زہد کا نکاح امیر ناصر الدین بکٹنگین کی صاحبزادی شاہزادی گوہر تاج (یعنی سلطان محمود غزنوی کی حلقہ بھڑیک سے ہوا تھا۔ امیر بکٹنگین کی وفات (ف ۶۹۹۶) کے بعد سید احمد زہد اپنے خاندان اور اترے واقارب کے ساتھ ہندستان چلے آئے اور پنجاب میں قیام ہو گئے۔ یہاں اقباز کے لیے خاندان کا نام سادات ترمذ مشہور ہو گیا۔ مدتوں بعد سید احمد زہد کے ورثا میں سید مہر علی شاہ تلندر پنجاب سے نکلے اور خیر آباد (ضلع سیٹاپور ایو پی) میں بس گئے۔ انہیں کی اولاد میں دسیم کے والد سید محمد مہدی تھے۔ یہ شعر بھی کہتے تھے: غلغلیں تخلص تھا۔

قریب ۱۸۵۵ء کے مشہور غمخویش سے پہلے پیدا ہوئے۔ اٹھیک سال معام نہیں ہو سکا۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ اس ہنگامے کے وقت میں سن شعور کو پہنچ چکا تھا۔ دسیم نے شکر گونی ورثے میں پائی تھی۔ انہوں نے کلام پر اصلاح امیر چٹائی (ف اکتوبر ۱۹۰۰) سے لی۔ وہ مدتوں استاد کے ساتھ رامپور میں رہے۔ امیر اللغات کی ترقیب و تدوین میں وہ امیر کے دستِ راست تھے۔ استاد کو ان کی زبانِ لہنی اور فنی بہارت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اکثر اپنے جلدی شاگردوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے۔ امیر اللغات کے علاوہ نور اللغات کی ترقیب میں بھی ان کا حصہ کچھ کم دبیع نہیں تھا۔

وسم تعلیم کی تکمیل کے بعد انڈیا انگریزی حکومت کی ملازمت میں داخل ہوئے لیکن جلد ہی اس سے استعفیٰ ہو کر توکل علی اللہ غازیہ انڈین ہو گئے۔ جب ۱۸۹۰ء میں جوہور کے رئیس راجہ ہری ہروت سنگھ دہلوی نے ان کے شاگرد ہوئے، تو انھوں نے امرار کے اپنے پاس بلا لیا اور اپنی زندگی بھر کہیں اور جانے نہیں دیا۔ جوہور کے دوران قیام میں انھوں نے یہاں سے ۱۸۹۴ء میں گلدستہ "گلشنِ جاری" کیا تھا۔ یہ پرچہ بعد کو خیر آباد اور نکستو سے شائع ہوا، پھر رند ہو گیا۔ ایک زمانہ بعد انھوں نے ۱۹۱۷ء میں سیتل پور سے شائع کرنا شروع کیا، اور اب اس میں نظم کے ساتھ نثری مضامین کا بھی اضافہ کر دیا۔

جب ۱۸۸۱ء میں مولوی سبحان اللہ خان رئیس گورکھپور کے بلائے ہوئے ریاض خیر آبادی گورکھپور گئے، تو موصوف کے ایسا پر ریاض نے وسیم کو بھی وہاں بلا لیا۔ وسیم رشتے میں ریاض کے بہنوئی ہوتے تھے۔ وسیم یہاں مولوی سبحان اللہ خان کے کن بھانے کے گھرانے ہو گئے۔ یہ قریبی تہا مجاز مولوی سبحان اللہ خان کی وفات کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دے دیا گیا تھا اور آج کل آزاد لائبریری کا ایک حصہ ہے۔ اسی زمانے میں وسیم کے ایک اور شاگرد نے تحفہ خوشتر کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا، وسیم اس کی تخریب میں بھی مشرک رہے۔

بالآخر ۱۹۲۲ء میں خاک خیر آباد کی کشش نے وسیم کو وطن بلا لیا۔ یہ سفر آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہوا، کئی مہینے کی حالات کے بعد ۱۹۲۹ء ۲۲۱ رمضان ۱۳۴۷ھ کو رنجڑے عالم جاودانی ہوئے۔ اپنی قیامگاہ محلہ شیخ سرائے کے محل کی مسجد مسکری میاں کے صحن میں سپرد خاک ہوئے۔ یہ مسجد بھی خود انھیں کے نام سے شہر ہو رہا، اگرچہ اسے ان کے جد امجد نے تعمیر کرایا تھا۔

سید امیر احمد اشیم انھیں وسیم کے خلع اکبر تھے ایہ جنوری ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سے بڑی ایک بہن وارثہ فاطمہ تھیں اور چھوٹے ایک بھائی سید فیصل احمد۔ یہ دونوں بھی شعر کہتے تھے۔ وارثہ فاطمہ کا تعلق منور رضا اور فیصل احمد کا نسیم۔ انھوں نے خیم

نے مغولانِ مشابہ میں ۳ نومبر ۱۹۵۲ء (۴ صفر ۱۳۷۲ھ) کو انتقال کیا۔ انیم نے اینگلو فائن
کچن، اس گھر میں پچیسیم بہشت (۱۳۷۲) اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں
موجود اسب ابدی میں۔ وارث فاطمہ کاسندیل میں مقدمہ ہوا تھا۔ وہیں ۱۹ اگست
۱۹۵۴ء کو لاؤلفوفت ہوئیں۔

انیم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی جب استعداد قابلِ لحاظ ہو گئی، تو مدرسہ نیازیہ
خیر آباد میں بھیج دیے گئے۔ یہاں نقادانِ کارل پسند موزموت تھا۔ فارغ التحصیل ہونے
کے بعد ضلع الطب کالج ٹکٹوں میں داخلہ لے لیا۔ دو سال تک یہاں تحصیل کی تھی کویک ایسا
حادثہ پیش آیا جس سے وقتی طور پر ریزرڈیشنہ پیدا ہو گیا کہ شاید وہ طب کی تکمیل کر سکیں۔
ہوایکہ ان کے والد نسیم صاحب کس کام سے راجہ صاحب محمود آباد کی ملاقات کو ٹکٹوں
آئے، تریٹ کے دیکھنے کو ضلع الطب کالج بھیجے۔ دورانِ گفتگو میں کس مناسبت سے
انہوں نے بیٹے کے کسی شعر کے معنی پوچھے۔ قصبتی سے یہ تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ اس
پر نسیم بگڑ گئے، بہت برہم ہوئے۔ فرمایا کہ یہاں تم ترقی ٹکٹوں کر رہے ہو۔ یہ کہہ کر انہیں
کالج سے اٹھا کے اپنے ساتھ واپس خیر آباد لے گئے۔ چند سے بعد لوگوں کے پچ بھاڑ
سے انہوں نے انیم کو معاف کر دیا، اور یہ واپس ٹکٹوں چلے گئے۔ انہوں نے ۱۹۵۷ء
میں طب کی تعلیم مکمل کی اور درجہ اول میں پاس ہوئے۔ پھر اگرچہ انہوں نے خیر آباد میں
یزمانی دواخانہ کے نام سے اپنا سطب قائم کیا، لیکن خود نسخہ بہت کم لکھتے تھے، زیادہ تر
مشہور مقامی حکیم انوار حسین صاحب کے نسخے ان کے پاس آتے تھے، جس سے اچھا
خاص کام چلتا رہا۔ بعد کو یہ سطب بھی بند ہو گیا۔

جب نسیم ہملوی سہان اللہ خان کے بلاوے پر گورکھ پور گئے، تو انیم بھی والد کے
ساتھ تھے۔ اس زمانے میں یہاں ریاض اور نسیم کے تیام کے باعث گورکھ پور گویا
شعرو سخن کا مرکز بن گیا تھا۔ انیم بھی وہاں کسی مقامی کالج (یا اسکول) میں اردو اور فارسی
کے مدرس ہو گئے تھے۔ اسی زمانے میں وہ ”گلچین“ اور ”تحدہ فرشتہ“ کے معاون مدیر بھی
رہے جب نہانے نے گورکھ پور کی بساط اٹھی، تو انیم اولاً صوبہ بہار گئے، جب وہاں قدم

نہم سکے، ترجمید سا باد رکھن اکي راهي۔ ایک زمانہ بعد ۱۹۴۹ء میں واپسی ہوئی۔ ۱۹۵۰ء۔
۱۹۵۱ء کا ایک سال وہ مدرسہ نیازہ، خیر آباد میں تاسی کے متعلق رہے۔ پھر جولائی
۱۹۵۵ء سے فروری ۱۹۶۰ء تک مدرسہ اشاعت العلوم، خیر آباد میں بھی یہی مشغل رہا۔ خیر آباد
میں اس زمانے میں جمال الدین، سیرانہاری کی مولدہ بی بی کے والدہ "کاروان" شائع ہوتا
تھا۔ انہیں بھی اس کے ادارہ تحریر میں شامل ہو گئے۔ جب "کاروان" نے دم توڑ دیا، تو یہ
کانپور پہنچے اور وہاں مدرسہ ارشاد یہ میں مکتبی کر لی۔ دو سال بعد ۱۹۶۲ء میں وہیں
کے ایک اور مدرسے حسن المدارس میں منتقل ہو گئے۔ کانپور سے ایک رسالہ "جھلک"
مچلتا تھا۔ مدرسے کے ساتھ اس کی ایڈٹری کے فرائض بھی سرانجام کرتے رہے۔ مقرر
اس رسالے کی پیشانی پر انجم کا یہ شعر چھپتا رہا تھا۔

جھلک دکھا کے بہت سکھاتی جاتی ہے

یہ آگ نور نہیں لگتی، لگا ئی جاتی ہے

آخری زمانے میں قیام پشور کانپور میں رہا، اگرچہ خیر آباد کی ادبی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی
لیتے۔ جتنے تھے مثلاً ۱۹۵۵ء میں خیر آباد میں ایک انجمن ادب قائم ہوئی، تو وہ اس
کے صدر بنائے گئے تھے۔ یہ انجمن زیادہ دن نہ چل سکی اور سال بھر بعد ختم ہو گئی۔

۱۳۹۰ھ میں رمضان کی چھٹیاں گزرنے کو وطن آئے یہاں احباب اور بچوں کے اصرار
پر کانپور کی واپسی ملتی کر دی۔ اتنے میں بیمار ہو گئے۔ خدا خدا کر کے مہینوں بعد بخار نے
ترجیا چھوڑا، خواب اہمال کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ یہ عمر اور اس پر ایسے موزی مرض کا حملہ
گزروئی ہونا ہی چاہیے تھی چند دن میں سوکھ کر کاشا ہو گئے۔ علاج معالجے کے باوجود
حالت بد سے بدتر ہوئی چلی گئی۔ اسی میں ۶ اپریل ۱۹۷۲ء قبل دوپہر سو گیا رہ بیچھ کے
قریب جان بحق ہو گئے۔ آخری الفاظ تھے: ازل اللہ، آخر اللہ۔ نازِ جان مد کا وہ خدوم
شیخ سعدی میں ان کے دوست سید نجم الحسن رضوی نے پڑھائی اور بعد مغرب انہیں
اپنے والد کیم کے قریب مسجد مسکری میاں کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔ مومری
نثار احمد فاروقی عارف خیر آبادی کے قطعہ تاسیخ وفات کا آخری شعر ہے۔

بروجہ مرقدہ عارف! ایں سالِ زفافش کن رقم
”روحِ ارب، کانِ مہفاستید امیر احمد اُستیم“

اور لاہور جہاں میں دولڑکے (یعنی احمد عرف انس میاں اور شیر احمد) ان سے یادگار
ہیں۔

انہوں نے کلام پر اصطلاح اپنے والدِ مکرم مرحوم سے لے لی، اور خود درجہ استاد کی حاصل
کیا۔ اس دور کے اکثر رسائل و جرائد میں ان کا کلام ملتا ہے نظم کے علاوہ نثر میں بھی بہت
لکھا اور اس میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے خوشنویس بھی اچھے تھے۔ تلامذہ کی بڑی تعداد
نے ان سے استفادہ کیا۔ انہوں نے مجموعہ کلام غیر منظرہ لکھا گیا۔ تمام اصنافِ سخن میں وافر
کلام ان کے اعتراف کے پاس موجود رہے۔ جناب دلی سینا پوری نے قدسی خیر آبادی
صاحب کا ترجمہ کچھ کلام لکھا ہے، اسی سے مندرجہ ذیل انتخاب پیش کر رہا ہوں:

وہ ہے زندگی بھر محبت کے بندے	نہم دین سب سے، نہ ایمان جانا
محبتِ ذریعہ ہے قربِ خدا کا	آئیم اس کو ہی ہم نے ایمان جانا
آپ ہی ہم میں دعا اپنا	نہیں ملتا، ہمیں پتا اپنا
مرد اپنی اگر ہمیں نہ کریں	کام نہ کئے کسی سے کیا اپنا
تجربے یہ جانتے ہیں کہ، انیم!	آسرا ہے قرا سرا اپنا
ہاں بہار آئی، آ کے جا بھی چکی	بیدلوں کے دروں کا کھلنا کیا
جان اگر جاتی ہے تو جا ملے انیم!	جو نہ ملتا ہو اس سے ملنا کیا
ہر پیر کے خود گرفتہ کوئی پیر کہیں گیا	سو بار کھنچا کھنچا تھا قسم پیر وہیں گیا
اتھا تو دل پڑ کے، گیا دل کو چھوڑ کے	عقل سے جو گھیا تری، نہ وہ گھیں گیا
گو ہر چکا ہے یاد فرا سوش آپ کی	لیکن جو انتظار اب، اتنا دل کا نہیں گیا
ایک میں ہوں کہ دنا پیر بھی نہ اس سے ملے	ایک وہ ہے کہ جفا کر کے پشیمان نہ ہوا
کام جتنا عقل نے مقدمہ کشائی سے دیا	اور کئی سر پہستہ ہر بار نہ نہاں بہت گیا

جو ہر دانش را معروض عرض انکشاف	زہن انسان بندہ دہم و گمان فنا گیا
دیجہ والے کا کیا کریں شکوہ	ہم کو حسن طلب نہیں آستا
نماز ہے شعلہ سرکش کو بھی دھنائی کا	ابھی دیکھا نہیں عالم تری انگنائی کا
میری محفل پہی نیرنگ تصور سب را	میری دنیا وہی گوشہ میری تہائی کا
اشکب تم کی ہم سمجھتے ہی نہ تھے کوئی بساط	یہ وہ قطرہ تھا، بڑھا، اور بڑھ کے دیدیا ہو گیا
جو نہ دنیا میں کسی کا ہو، کہیں کا وہ نہیں	اس کو کچھ کہنا نہیں کسی کا ہو گیا
رہتے رہتے دل میں اب تو ہم کسی کا ملے دھیم	دل کا اراں بن گیا، دل کی تمنا ہو گیا
یگانگی دل کا نہ کچھ پوچھا جس را	یہ آشنا ملا بھی، تو نا آشنا ملا
کوئی تو بات ہے کہ لا جب کبھی اخیم	اس کی گلی میں ہم کو بھٹکتا ہوا ملا
خیم سے آزاد ہی نہ تھا گویا	دل مراد ہی نہ تھا گویا
دل کو آباد ان کی یاد سے ہے	کبھی برباد ہی نہ تھا گویا
عشق نے یوں مشاودیا سب کچھ	کچھ مجھے یاد ہی نہ تھا گویا
دل کی دیرانگی کوئی دیکھو	کبھی آباد ہی نہ تھا گویا
جان دے دی اند آف خیم نے کی	دہم فریاد ہی نہ تھا گویا
اس نے دل و جگر جریے میا ہوا، اخیم!	جو کئی ہمیں خدا نے دیا، سب اسی کا تھا
بالیدگی روح کا رکشا نہیں اثر	وہ قطرہ سرشک و حوٹناں نہ ہو کا
کرتے ہوا اس کے مشرب وقت کا لگا	کافر تو کیا، اخیم سداں نہ ہو کا
نہینہ تمام درد سے معمور ہو گیا	سا ان راحت دل رنجور ہو گیا
دل کے ہر گوشے میں ارمانوں کی کہے سنی ہے	ایک ہی ہوتا، بگڑا سب کا اراں ہوتا

زباں کوئی سمجھتا ہے، نہ اندازِ بیاں اپنا
 ششاسا ہی نہیں کوئی، خداوند ایہاں اپنا
 یقین تو ہے، مریے بردھوے کی تصدیق ہو جاتی
 نہیں منظور ہے، افسوس، ان کو استخاں اپنا

شکار آپ اپنی ادائی کے ہم میں اپنے ہاتھوں سے
نڈھیں ہے نہیں اپنی، نہ دشمن آسماں اپنا

بغیر اس کے جینا ہے بیکار جینا مگر زندگی ہے تو ناپا رجینا
جور ویاہنگی ہو مگر جاتے جوں توں عرضی میں اس کے ہیا رجینا
نہیں عشق میں یوں کی کوئی صورت اک آزار مرنا، اک آزار جینا
ایم! ایسے جینے سے مرنا ہی اچھا کر جینا، مگر با دل زار جینا

جب کام ہی تمام کیا اپنا در رٹے اب کیا بتائیں، درد کہاں تھا، کہاں نہ تھا

مجھے ان کے بھی نام ہیں یاد بہت، کبھی جن کا جہاں میں نہ لانا رہا
وہ فائدہ فساد نہ بنا تو ا مگر نہ زمانہ رہا، نہ فائدہ رہا
تجھے جو رستم کا مزا نہ رہا، ہیں شکوۂ جود و جفا نہ رہا
نہ وہ تو ہی رہا، نہ وہ ہم ہی رہے، نہ وہ جوش جنوں کا نہ رہا
نہ تو تیس رہا، نہ تو بلی رہی ا رہاں شیریں مری، گئی گھر کین
نہ وہ شہرت حسن و جمال رہی، نہ ہی جوش جنوں کا زمانہ رہا
تصویر ہر نہ خوشی، کوئی جو نہ مرے اتھیں رنج نہ ہو جو کوئی نہیے
تجیں اپنے ہی کام سے کام ہے بس تجیں کیا کہ رہا کوئی یا نہ رہا
نہ وہ درد رہا، نہ وہ سود رہا، نہ وہ فیس رہی، نہ حشر ہی رہی
ہے اگرچہ اک آگ کلل میں لگی، مگر آہ کد اب وہ مزا نہ رہا
مری موت کو سن کے غم نہ کھا، کوئی غم تو نہیں ہے یہ غم ایسا
مجھے غم ہے اگر تو ہے غم اس کا، کوئی دہر میں اہل وفا نہ رہا

زندگانی میں زرا حقوق کی ہوسریں تو بکرو بن ہی جائیگا یہ افسانہ فسون آپ کے آپ

درد کی قدر معلوم ہی نہیں ہر سبکی اتنا تپ دل کی ہے نہ وہ کے غم آپ کے آپ

سنائے نکلا ہوں غم، میں دل نکلا روں کو ڈھونڈتا ہوں

باب اشعار باب میں ہیں شکستہ تاروں کو ڈھونڈتا ہوں

زحمتِ خواباں کی آرزو ہے نہ جلوہ زاروں کو ڈھونڈنا ہوں

نظر کے دامن میں جو پھسے ہیں، میں ان نظاروں کو ڈھونڈتا ہوں

کھلے تو کھینچ کر کھلے حقیقت کو مہرِ رب ہی ہے محبت

جودل کے مضمون کی ہے عبارت، میں ان اشاروں کو ڈھونڈتا ہوں

جوا ہے مشرب کے لوگ ہوتے ہیں، ڈھونڈتی ہے انہیں کو دنیا

نظارہ کرنے ہے جان بھر کر، میں جانِ نشادوں کو ڈھونڈتا ہوں

ایم ایم چشمنظر، شگفتگی ہوا سہیں مبارک

دلِ شکستہ یے ہوتے ہوں، میں دلفگاروں کو ڈھونڈتا ہوں

شکوہ گرِ رش کا آپ کو ہے ایشم! گشتِ عاقبت سے نکلے کیوں؟

کیا چیز یہ پُر غلوں یا راند ہے کیا شے دو غلوں کا افسانہ ہے

بیگانہ وفا کرے، تو اپنا ہے ایشم! اپنا نہ وفا کرے، تو بیگانہ ہے

بیفادہ شغل، گھونٹِ غم کے پینا بیکار سی بات زخمِ دل کے سینا

دوبہر کتنی ہی زندگانی ہو، ایشم! جب تک نہ اہل آئے، ہے اربس جینا

رکھنے کو تو رکھتے کتنے جو ہر ہیں ہم

نا چیز ہیں، خاک کے برابر ہیں ہم

سب کچھ عرفِ حسنِ حق پر ہے، ایشم!

ماؤں تو دیوتا، نہیں، تو پتھر ہیں ہم

علیم اختر مظفرنگری، محمد عبید اللہ صدیقی

ان کی ولادت ۶ جون ۱۹۱۴ء کو ضلع مظفرنگر کے قریب ایک قریہ حسین پور، بیٹور میں ہوئی (اصل میں لفظ بیٹور کا جوہر زمانہ سے دیہاتیوں نے بگاڑ کر بیٹرا بنا دیا) ان کے والد جناب محمد عسراف (۱۹۵۵ء) مدرسہ پیشہ تھے؛ وہ ساری عمر مختلف مقامات پر صدر مدرس رہے۔ علیم صاحب نے ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول، مظفرنگر سے جیویں درجے کی سند حاصل کی۔ آٹھویں تعلیم جاری رکھنے کے وسائل مفقود تھے، اس لیے اب تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ ۱۹۳۶ء میں ایک مقامی زمیندار کے ہاں کارندہ سے مقرر ہو گئے۔ تین سال بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری جگہ غلیم شہر ہوئی، توفیق جیویں کی ضروریات مہیا کرنے کی خاطر حکومت نے کھل رانی کے کارخانے قائم کئے تھے۔ یہ کام بہت کچھ پیانے پر ہوتا تھا۔ ہندی سے اٹل کی خرید سے لے کر کھل کے بچنے تک کا سارا کام سرکاری ملازموں کے ذریعہ تھا۔ علیم صاحب اس محکمے میں پچیس روپیہ ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ ہنسلے پر۔ وہ مظفرنگر، نرپڑا، امرہ، جالندھر، کیرانہ وغیرہ مختلف مقامات پر کام کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ خواہ میں بھی ترقی ہوئی رہی۔ انیسواں ہجری کے کام سے ملحق تھے، اور یہ خود بھی سکون سے تھے کہ اب مقررہ سپہ شاہو تھا۔ لیکن اواخر ۱۹۴۱ء میں بہتر ملازمت مل جانے کی وجہ سے یہ نوکری چھوڑ کر جنرل اسٹور کا پور چلے گئے۔ یہاں سے کٹنی تبادلہ ہوا اور وہاں سے ناگپور جانا پڑا۔ ناگپور میں تھے کہ یرقان کا شدید حملہ ہوا۔ اس پر سولہ مہینے کی طویل رخصت، علالت، لینا پڑی جس کے باعث ملازمت سے جواہل گیا۔ ۱۹۴۶ء میں تندرست ہونے کے بعد وہ واپس آئے، تاکہ یہاں

کنٹر ورنزل کے دفتر سے دوبارہ ملازمت کا حکمنامہ حاصل کر سکیں، مگر اس میں کامیابی نہ ہوتی۔ بسراوقات کے لیے رتی کے قیام کے زمانے میں یہاں کے مختلف رسائل میں روزانہ تھوڑا تھوڑا وقت کام کرتے رہے۔ بالآخر ۱۹۴۲ء میں مستقل طور پر اپنا نامہ شمع کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ اس ادارے کے دنوں پرچوں (شمع اور شبستان) کی تقسیم و اشاعت اور دفتر سے متعلق قانونی کام کا ج انہیں کے ذمے تھے۔

پہلی مرتبہ ۱۹۴۱ء میں ان پر دل کا دورہ پڑا۔ اسپتال میں چند ہفتے رہ کر گھر آ گئے، کچھ لگے، یونہی ٹراکٹروں نے ڈرایا اور دکان کیا، صرف نشار دم کا عارضہ ہے لیکن یہ بعض نفس کا دھوکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے احتیاط رہے ہو گئے۔ دوسرا حملہ بھی اچانک ہوا اور یہی جان بوجہ ثابت ہوا۔

مجھے کے دن ۲۱ اپریل ۱۹۴۲ء صبح کے وقت مسیہ معمول دفتر آ گئے۔ یکایک بیٹھے دوسری شکایت کی۔ ہمدرد نرسنگ ہو شمع کے دفتر کے پڑوس میں ہے، وہاں پہنچا یا گیا بیوی بچے بھی پہنچ گئے۔ ان سے بات چیت کرنے لگے۔ معاملے کی نزاکت کا کسی نے احساس نہ کیا۔ باتیں کرتے وہ بہر کے قریب روحِ نفسِ غھری سے پرواز کر گئی۔ اللہ و اتالیقہ راجعون۔ اس شام درگاہِ آلیہ اللہ ہمیں بخشنے میں آئی۔

اولاد میں چار لڑکے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑے صاحبزادے عظیم اختر حکومت ہند کے محکمۃ اطلاعات میں ملازم ہیں، چھوٹے بیٹوں ابھی زیر تعلیم ہیں۔

شعریں انہیں لہذا لم تغفر غری انہی ۱۹۶۹ء سے تھا، اگرچہ زیادہ تر استفادہ سیلابِ اکبر آبادی ہجوم سے کیا۔ کلام کا مجموعہ ”نکبتِ گل“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ (دتی ۱۹۹۵ء)۔ اس پر یونانی حکومت نے انعام بھی دیا تھا۔ ایک مختصر مجموعہ قطعات (مستور) بچوں کے لیے ”پھول پتے“ کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں خود شائع کیا تھا، جس میں پہلی اور سادہ زبان میں سبق آموز قطعات شامل ہیں۔ ایک مجموعہ نعت ”انوارِ حرم“، بچوں کے لیے دوسرا مجموعہ نظم ”گل بوٹے“ اور ”بوے گل“ (دیوانِ غزلیات)

مرتب شدہ غیر مطبوعہ چھوڑے۔

میں انھیں پچھلے ۲۰-۲۲ برس سے جانتا تھا۔ بڑے مخلص اور پہلے دیا دوست تھے۔ حال آں کہ بعد مذہبی آدمی اور صوم و صلوة بلکہ اوراد و وظائف تک کے پابند اور حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (ف ۱۹۵۷ء) سے بیٹ تھے لیکن طبیعت میں ہنس مٹ نہیں تھی اس کے برعکس ان کی گفتگو میں شگفتگی اور بذلتی کا عنصر غالب ہوتا تھا میں نے انھیں کبھی بیماری کی حالت میں بھی انگلیں اور گزرتے خاطر نہیں دیکھا۔ دعا ہے کہ اسی طرح خوش خوشی وہ اپنے خالق کے حضور میں بھی حاضر ہوئے ہوں۔ آمین!

ہجرات مدنی نے خدمتِ نبویہ و فرائض میں گویا ان کی پوری سیرت بیان کر دی ہے :

اکیس اپریل، جہانگیر کا وقت	طے پہچانت کیا عدم کا سفر
کر گئی آ کے خود اذانِ مرگ	بے نیاز نہ رکوع و سجدہ و سر
مرتب پنجادہ بہشت سال تھی عمر	زندگی اس کی تھی مثالِ خسرو
درود دل نے کچھ ایسی کر دلی	کر سکے کچھ نہ اس کے چارہ گر
شاعر نغزگو، ادیب شہسیر	عابدِ خوش مذاق و نیک سیر
غوب ہنستا رہا، ہنستا رہا	اپنے ہم کی نہ دی کسی کو خسر

دل کے ہاتھوں ہی لٹ گیا، اعجازِ

شاعرِ دل زوہ مسلم اختصار

علیم اختر مرحوم کے مجھ سے بہت رگتا لگت کے تعلقات تھے۔ انھوں نے میرے نام کا سبب بھی کہا تھا!

اومیں کہ میرا نام بھی اللہ کا اک نام ہے

کیوں نہ کہ ہو، اخترا مجھے بسببِ میرا لک رہا ہے

انھوں نے اپنی وفات سے چند ہی دن قبل اپنے دوسرے (غیر مطبوعہ) دیوان "بڑے گل" کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا نسخہ بطورِ یاد مجھے دیا تھا۔ سند و جزئیات اختصار اب اسی

دیوان سے ہے۔ ان کا پہلا دیوان ”نکست گل“ شائع ہو چکا ہے، اور بازار میں دستیاب ہے۔

آپ سے دوستی کیے نہ بنی	ہم سے یہ دشمنی کیے نہ بنی
اندازِ تہجدِ یدِ ربہ در رسمِ ستم	ماہِ لطف و کرم بارِ دگر ہے کوئی
عشق اس کا دیہرت سے گندھا ہے	کوئی منزل نہ جہاں رگِ زہ ہے کوئی
بہتا ہے وہ اس اور اس بھر دل	کیا ہر کوئی بات ہو گئی ہے
اے مرگِ محبت! آج تجھ سے	تخیلِ حیات ہو گئی ہے
غم سے بھی بے نیاز، خوشی سے بھی بے نیاز	کیا کشمکشِ غم کا بنا یا گیا ہے دل
تیری جفا نے حوصلہ غم بڑھا دیا	ظلم و ستم سے داغِ وفا پا گیا ہے دل
اے فرطِ اضطرابِ محبت! خبر نہیں	دل بے قرار ہے کہ نظر بے قرار ہے
ہائے موہ غم کی منزلِ تہوار	عشق کو بس شکستہ پا دیکھا
اور بھی دور ہو گئی منزل	ہم نے جب کوئی آسرا دیکھا
اب بار بار ان کی ندامت کا ہے خیال	اتھے کو اٹھ تو آئے ہیں اس انجمن سے ہم
اب ان سے کوئی رسمِ ملاقات نہیں ہے	اور بات ہے اتنی کہ کوئی بات نہیں ہے
اب خود نگہِ ناز ہے بیتِ سبِ گزارش	کیا جانے کیا بات ہے، کیا بات نہیں ہے
کسی کا وعدہ فردا، وفا تو کیا ہوگا	یہ نکر ہے کہ وفا ہو گیا، تو کیا ہوگا!
بلندِ انگِ ارادوں کے باوجود انسان	خود آدھی بھی نہیں بن سکا، تو کیا ہوگا!
وہ اک غلط ہے کہ جسے آرزو ہے فوقِ کہیں	جو بن گئی وہی خود دعا، تو کیا ہوگا!
نسانہ غم ہستیِ مستان و دوں ایسکین	جہیں ناز پہ بل آگیا، تو کیا ہوگا!
وہ ہشیانِ شکاہی، دو کمالِ رعنا!	ایک رنگ آئے ہے اک رنگِ آرزو ہے
اے زہے کاہشِ غم، تابشِ رنائیِ شرق!	زندگی ہے کہ بہ طورِ مسخوڑ جائے ہے
غمِ حیات، غمِ جاوداں نہیں ہوتا	غمِ حیات مگر زندگی پہ بھاری ہے
ہزار پیش و سترت کے باوجود، اخترا	وہ کون ہے کہ جسے غم سے رستگاری ہے

وہ فرط کیف بادہ، وہ انفاسِ خطر سبز
 اک بزمِ سوگوار، مری شامِ انتظار
 وہ نکستہ تمام، وہ بوئے سخن کی بات
 اک مشرتہ تمام، تری انجمن کی بات
 اوجھڑ رہی ہے سنہری کرن، سبولاڈ
 کیوں نہ اپنے جنم کی بات کریں
 اب کہاں نگرِ دفن کی بات کریں !
 گل کی چسبنِ دل کی سکرانی ہے
 دلوں کو سایہِ غم ہی میں نیند آئی ہے
 نکالنے جا رہے ہیں رَدستی سے
 مگر یہ آنکھ میں آنسو ابھی سے !
 نہ کچھ کہنا، نہ کچھ سنا کسی سے !
 کیا پھر کوئی بات ہوئی ہے !
 جیت بھی اکثر مار ہوئی ہے
 نگہِ شوق کو رہ کے غماں ہوتا ہے
 پھر وہ کیفیتِ دل، ترکِ ملاقات کے بعد
 ویسے تو نہ آنے کے بہانے ہیں ہزاروں
 وہ عرضِ غمِ شوق پہ خسا موتی بہیم
 اس طرح چپ ہوں کوئی بات ہوئی جو جیسے
 بے یہ عیش و مسرت، یہ خوشی کا عالم
 ل کے اب ان سے یہ محسوس ہوا ہے اخترا
 کس کے غم میں خراب ہو؟ اخترا
 وہ اک نظر کہ جسے اتفاقِ ناز کہیں
 ستم و جبرِ گاہ نگاہ نہیں
 یا انہیں رخصتِ جفا نہ تھی
 یا ابھی فرصتِ نگاہ نہیں

کون بتاتا ہے خبر سوختہ سامانوں کی !
 اٹھ کے محفل سے تری بجائے کہاں پہنچیں
 شوق کس منزل پر کیف پرے آیا ہے
 بات بڑھ کر تری مستی نظر تک پہنچی
 دل ہی شاد کام شوق نہیں
 وہ نہ جب تک لے رہا احساس
 جسم آدم پہ ہے درتار لباسِ خلاص
 اب مرے نقش کعب پا میں نشانہ منزل
 نگہ شوق کی یہ نگاہ روی کے صدے
 کیا تماشے نظروں پہ ترے دیوانے
 رہر و راو محبت ارگزار عشق میں
 جلوں سے ترے انجمن دل ہے ستور
 کہا بے جز ترے لطف پہنازاں بے کوئی آگ
 جب گناہاں حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یقین
 نگہ لطف کا پردہ ہے آغوشِ اختر
 شاید اک دوسری تقدیر نمایاں ہو جائے
 تارسانی میں ہے اک جہد مسلسل کلایام
 کوئی ہدم بنے نہ دمساز، نہ کوئی آواز
 اختر اس میں تو کہیں ذکر نہیں ہے ان کا
 تعجب ہے کہ حمد سے پوچھتے ہو
 کوئی آہٹ بھی نہیں ہے کوئی دستک بھی نہیں
 کچھ تو ہے ہم جزری بزم میں آئے ہی نہیں
 فاصلوں کا بھی تعین نہیں ہونے پاتا

کسے معلوم کہاں فلک ہے پروانوں کی
 اب تو آواز بھی آتی نہیں دیوانوں کی
 شوق اپنا ہے نہ کچھ فکر ہے یہ گانوں کی
 گفتگو چھپر گئی زندوں میں جو میخانوں کی
 خشبِ غم میں بھی دکھائی ہی ہے
 زندگی میں کوئی گھسی مٹی ہے
 اکویت ہے گل لاشہ بے گور و کفن
 کام ابھی گیا شوق کا دیوانہ پن
 ان دنوں میری وفا کو تھے تلاشِ دشمن
 کبھی نناک نگاہی کبھی ابرو پہ شکن
 جو ٹھہر جائے ہے اگر درکاراں ہو جائے
 آنکھوں کو گر دید کے ارمان رہے ہیں
 ام بھی کبھی مشر مندۂ احسان رہے ہیں
 کیا تھیں سنگِ مرمرِ منزل او بام بھی ہے
 یہی انداز بھری بزم میں الزام بھی ہے
 اپنے اٹنے کی لکیروں کو مٹا بھی دیکھو
 ظلمتوں میں جو چھپی ہے وہ ضیا بھی دیکھو
 راہ میں حوصلہ آبلہ پا بھی دیکھو
 یہ فساد اٹھیں اک روز مٹا بھی دیکھو
 علیمِ اختر! تجھے کیا ہو گیا ہے؟
 شوقِ حجاب مگر جانبِ در دیکھے ہے
 کبھی آتے ہیں تو آجاتے ہیں آتے جاتے
 راستے کتنے بدل جاتے ہیں آتے جاتے

ایسے لگتا ہے کہ یہ خط مرے نام آیا ہے
وہی وعدہ، دل پر شوق کے کام آیا ہے
اب کہیں جہاں کے تراود مدد شام آیا ہے

خود فریبی کا بُرا ہو کہ خود اپنی تحریر
وہ تراود مدد فردا کہ جو ایفانہ ہوا
دن تو سوہم امیدوں کے مہاے گزرا
جلالِ آزادی

(۱۱)

ہر اک نگاہ کو تھی جستجو سے آزادی
ہر اک زبان پہ تھی گفتگو سے آزادی
دلِ غلام میں برسوں رہی کسک بن کر
بقدرِ شوق و وفا آرزو سے آزادی

(۱۲)

نضایں مگوخ اٹھا، انقلاب زندہ باد
یہ کس نے چھیڑ دیا ہے رہا بہرِ آزادی
جھلک رہی ہے شہیدوں کے خون کی مٹی
ہلک رہا ہے چمن میں گلابِ آزادی

(۱۳)

جلالِ بادشہی، مصلحتِ نہا نیاتی
مری نگاہ تھی آئینہ راہِ آزادی
نشانِ جاوہِ منزلِ تنہا بہرِ انقضِ قدم
چلی تھی ساتھ میں خود رہ گزارِ آزادی

(۱۴)

یہ سوچا ہوں مرازمِ شوق ہی تو نہیں
یہ ایک راہِ رُخسِ گلابِ آزادی
مرے غلوں، دفا کی حکایتیں ہی نہیں
یہ ایک تارِ رنگیں بننا، آزادی

(۱۵)

اگست کی یہ ہندوؤں کی جس میں پنہاں ہے
عروجِ نقطہ صد ماہِ رسالِ آزادی
جھلک کے دامنِ رنگیں سے گردِ محکومی
یہ، جوئے ہے جلوسِ جلالِ آزادی

ظفر، سراج الدین ظفر

ظفر رامہل ان کا تخلص نہیں تھا، بلکہ جزوِ علم تھا، ان باپ نے یہ نام خاندانِ مغلیہ کے آخری تاجدار سراج الدین ظفر کے نام پر رکھا تھا۔ اسی لیے جب بعد کو انہوں نے شعر کہنا شروع کیا، تو تخلص کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۱۲ء کو (جہلم پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان لکھنؤ کہلاتا ہے۔ ان کے دادا لکھنؤ کی شاخ اسکندریہ کے شیخ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ قوم ایرانی الاصل ہے۔ والدِ اہل ان کے والد محمد عبدالقادر صاحب ریل کے محکمے میں انجینئر تھے۔ ان کی والدہ سمن (زینب) عبدالقادر اور دو حلقوں میں انسانہ نگار کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں اور کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے ناول راہِ صدا سے جس، داوی قاف، لاشوں کا شہر و غیرہ خاصے مشہور ہیں۔ اور زمانے کا مذاق بدل جانے کے باوجود آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔ سمن عبدالقادر کو تعصیف کا شوق اپنے والد مولوی فقیر محمد (یعنی ظفر کے نانا) سے ملا۔ مولوی صاحب موصوف دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی دنیاویات سے متعلق متعدد مصنفات موجود ہیں۔ عدائقِ الفنیہ ان کی مشہور تعصیف ہے۔ کوئی پچاس برس تک وہ ایک پرچہ سراج الاخبار تکبیر نکالتے رہے تھے۔

ظفر نے ۱۹۳۲ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے دو سال بعد کالت کی سند (ایل ایل بی) لاہور سے حاصل کی (۱۹۳۵ء) انہوں نے اولاً کالت ہی کا پیشہ سب از قات کے لیے اختیار کیا، لیکن اس میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر انہوں نے اے آر کے مدد سے جنگ عظیم کے دوران میں فوج کے ہوائی

شیخہ میں ملازمت کر لی۔ اس زمانے میں انھوں نے ہرا کے محاذ پر جاپان کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ وہ اس محکمہ میں دس برس رہے، لیکن یہ ملازمت بھی بھاری پتھر ثابت ہوئی۔ جنگ کے خاتمے پر وہ اس سے الگ ہو گئے، اس وقت گروپ کپتان کے عہدے پر فائز تھے۔ اب سب طرف سے مایوس ہو کر انھوں نے ۱۹۵۰ء میں تہارت کی طرف رخ کیا۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا لاہور اور کراچی کے مشہور ناشر کتب مولوی فیروز دین (صاحب فیروز سنز) کی صاحبزادی (بشیرہ) سے نکاح ہوا تھا۔ مولوی صاحب موصوف نے ان کی ڈانٹوں اور ذول حالت دیکھ کر انھیں اپنے ادا سے میں جنگ دے دی۔ اس کے بعد ان کی معاشی تنگ و دو اور پریشانی کا دور گویا ختم ہو گیا، اور اب وہ خاصی کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئے۔

انھیں آخری چار پانچ برس دردِ شقیہ کی شکایت رہی۔ جب اس کا دورہ پڑتا تھا، تو اتنا شدید کہ وہ بالکل اذکارِ رفتہ ہو جاتے تھے۔ علاج میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی، لیکن میسورہ نہ صرف اس سے کوئی فائدہ ہوا، بلکہ روز بروز حالت بگڑتی ہی گئی۔ دماغ کی تمام رگیں متورم ہو گئی تھیں اور اس کا اثر دل تک پہنچ گیا تھا۔

جس علمی اور ادبی ماحول میں وہ پیدا ہوئے تھے، اس میں ان کا حسیف و مایف کی طرف مائل ہونا قدرتی امر تھا۔ وہ بہت ابتدا میں شریکینے لگے تھے، اگرچہ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے اس میں کسی سے مشورہ نہیں کیا، نہ کسی سے اصلاح لی، لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے۔ شروع میں انھوں نے مزد سیاح اکبر آبادی سے اصلاح لی، لیکن پھر بعد کہ مشورہ لینا ترک کر دیا ہو۔ شعر کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ "عجبت از کسپرس" دورانِ جنگ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ریاکار مذہبی حلقوں کے بارے میں طنزیہ افسانے ہیں۔ دوسرا مجموعہ "آئیے" کے عنوان سے چھاپا (۱۹۴۳ء)۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ "نمزمہ حیات" ۱۹۳۶ء میں اور دوسرا "غزلی غزل" فیروز سنز کی طرف سے مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس پر انھیں مارچ ۱۹۶۹ء میں صدرِ مملکت کی طرف سے "آدم جی ادبی انعام" (پانچ ہزار روپے) عطا ہوا۔ انھوں

نے کسی زمانے میں بچوں کی درسی کتابیں بھی خاصی تعداد میں لکھی تھیں۔ سنا ہے کہ انگریزی میں بھی شعر کہتے تھے، اگرچہ یہ میری نظر سے نہیں گزرے۔

انھیں لغت اور صرف و نحو سے بھی غیر معمولی شغف تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ نئی نئی ترکیبیں وضع کرتے اور انھیں اپنے شعروں میں استعمال کرتے۔ اس سے ان کے کلام میں بانٹکین اور ایک طرح کی تازگی اور سرسستی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

انھیں علم نجوم اور جفر میں بھی غیر معمولی ہمارت حاصل تھی۔ وہ اکثر اپنی پیشگوئیاں اخباروں میں شائع کر دیتے تھے، اور حیرت ہے کہ ان میں سے بیشتر صحیح ثابت ہوئیں۔

ان کی زندگی بابریدش کوشن کے عالم دوبارہ نیست کی علی تفسیر تھی۔ انھوں نے مقدّر بھر اپنی شیعہ حیات و دونوں سروں سے جلائے رکھنے میں کہیں کوتاہی نہیں کی۔ ان کی شاعری میں لذت اور ابقوریت کی جو فراوانی ہے، تو یہ نہ محض سخن گسترانہ بات ہے، نہ شاعرانہ مبالغہ۔ انھوں نے ایک شعر میں اپنی زندگی کی تصویر یوں کھینچی ہے:

ہم سارنہ با کہست، کیا کوئی ہو گا کہ ہم دن کو درویشی کریں، راتوں کو مطلقاً کریں
اور یہ امر واقع ہے۔ باکرامت درویشی کا یہ عالم تھا کہ واقعی دن بھر اصحابِ علم کی صحبت میں قصوف اور اخلاق کے مسائل پر مصروف سخن رہتے۔ بیسیوں نادار اور عسیر الحال ادیب اور شاعران کے وظیفہ خواہ تھے۔ تند و غریب طالب علم ان کی نیامی کی بدولت تعلیم پا کر اپنے پانوں پر گھڑے ہونے کے قابل ہو گئے۔ جب بھی ان میں سے کوئی صاحب ان سے ملنے کو آہاتے، تو وہ ان کی پذیرائی میں بچھے جاتے۔ لیکن شام ہونے کے ساتھ ہی ان کی طلبِ ماہیت ہو جاتی؛ اب ان کی شخصیت ایک دوسرے روپ میں جلوہ گر ہوتی اور وہ اپنے اس شعر کی تصویر بن جاتے:

نرش گل بچھو امیں، رنگ و بو کی لذت لکریں آؤ، بلقیس کی دوراں سے سیلانی کریں
ان کے کلام میں شکوہ ہے۔ انھوں نے مختلف رنگین رنگیوں کے پردے میں غزلوں و نظمیں
کی ہیں، ایسے دلکش انداز میں کہ میں کر شاید عام حالات میں نظر ان کی گہرائی تک نہ پہنچے چند
شعرلاحظہ ہوں :

حش فم سے شراب اترتے دیکھی	روح مہ و آفتاب اترتے دیکھی
بیخانے کی املائے نہ دیکھی گویاں	ہر روز نئی کتاب اترتے دیکھی
دو میں صاحبزادوں سے ملات گزگیا	یہ تجربہ کرو نہ کسی پاکباز پر
یوں زندگی پر سیری نظر ہے کہ جس طرح	اک جسم مرمی کے ٹیپ ڈرائیو پر
عشق ہر شق، تو دہری میں بھی ہے لذت خاص	اس کا اسکاں کہہ دے دی گئی کم ہوا نہ سہی
سجدہ حقوق غنیمت ہے، جہاں ہو جائے	اس میں یہ حقوق کہ مراد ہر دم ہوا نہ سہی
ہر ایک چیز جو اس حق جو آج صبح کو ہم	کناہ شاہد نوز و نوجواں سے اٹھے
ادھر خالی حرم میں، ادھر تہاں گشت	بے تکشش میں قیامت کہ اب کہاں گئے
بیخانے سے چلی تھی کوئی بیخودی کی بات	اک حرم میں کشف و کرامات ہو گئی
اُتری نہ تھی سُبُوں، تو کچھ بھی نہ تھی شراب	اتری سُبُوں، معرفت ذات ہو گئی
فہم جہاں کر بلا ہو گیا ہے سب کے لیے	مرے سپرد کرو اس کو ایک شب کے لیے
دراز دست کیا پہنچے یہاں مرادوں کو	نہیں وہ دولت زلف و راز سب کے لیے
آساں نہیں تلاش حرم جمالی دوست	کچھ دن جلاؤ شمع مہ و آفتاب اور
جانے، کیا کیا دراز اور ابھی کئے ہیں طے	ہم ابھی ذہن خداوندی میں اک اندیشہ ہیں
خشت و سنگ، اترا خید ہے ابھر اخلاص	سیکساروں کی ٹکاپیں ہیں کہ طرب پیشہ ہیں
بت پرستی کیجیے اس شدت احساس سے	سنگ میں بھی جزو احساس و خیر رکھ دیجیے
آیا نظر جہاں کوئی بھٹکا ہوا غزال	ہم ابھی بڑے غلوں میں دلی سے بھٹک گئے
کھینچی اگر تو ہرش میں کھینچینگے زلفِ زوت	منظور یہ تو ذی کاسہارا نہیں ہیں
زاہد کو خانقاہ میں ملتی کہاں شراب	لیکن کچھ ہستام رسد ہم نے کر دیا

ہر ایک نظر ہے میری نگاہ میں بجز شعور
 پہنچ کے پردہ اسرار تک میں لوٹ آیا
 اس کے سوا کچھ اور نہیں راز کائنات
 اسرار زندگی سے جو پردہ اٹھائیں ہم
 وہ پردہ اسرار ہو، یا پردہ معل
 میں گردشِ ایام پہ پڑنا ہوں کہ اس میں
 دیکھا ہے بظہرِ اتحاد کو خرابات میں ہم نے
 اربابِ نظر دیکھے، پیرانِ حسرم دیکھے
 خلوت میں نہیں جن سے امیدِ کرم کوئی
 آنکھیں کھلی ہیں اور زباں پہ ہے قفلِ ضبط
 اے دوست! اس زمان و مکان کھنڈیابی
 نہ پوچھو شوق کا عالم کہ شہرِ خواباں میں
 نیاز کا ہے یہ عالم کہ جب خدا نہ ملا
 یارب! کبھی نہ ملے ہو مری راہِ اشتیاق
 اب دل کے زباں پر ہو سز نقد و نظر کیا
 آیا نہ میرے ہاتھ جو وہ شاہِ مراد
 پھر پریشاں ہو کوئی زلفِ سخن ہو اور ہم
 اُدھر یہ در قیامت میں تھی کہ ٹھو کرتے
 متاعے میں جو آتی تو ہم سے دستِ دراز
 ہم اس جہاں میں تھے کل شب کسی کے ساتھ کرگ
 جامے دوش پر کھلتی، تو تیری زلف سے ہم
 خلوتِ شب میں جو در پہ ہوز لیخاے بہار
 کہاں کے دیر و دم، آؤ ایک سجدہ ہر ش

ہر ایک ذرہ ہے دنیا سے آگہی مجھ کو
 نہ تھی پسند ملائک کی ہمرہی مجھ کو
 اک ذرہ جمال برابر و خستہ ہوا
 اپنے سوا کسی کو نہ موجود پائیں ہم
 ہاتھ اپنے پہنچ جائینگے بے اذن و صلا بھی
 تو ہو بھی تری ہے، حرے انداز و اداسی
 تجھ کو بھی ہے ڈھنی کراستہ، ارے اباجی
 زند دل کی طرح لیکن، پہنچے ہوئے کم دیکھے
 جلوت میں کوئی ان کا اندازِ کرم دیکھے
 یہ حکم ہے کہ دیدہ دوری کی زکات دے
 دشمن ہے جو کسی کو دعاے حیات دے
 ملا جو شخص، ہوا مجھ کو آشنا معلوم
 ہیں پرستش بت بھی ہوئی سجا معلوم
 جو بھی قدم اٹھے، قدم اڑیں رہے
 اب ان سے گریزاں ہو تو ہے دل کا زیاں اڈ
 اپنے ہی اشتیاق سے میں ہم بغل ہوا
 راتِ تیر تحقیق اسبابِ پریشانی کریں
 ادھر سے پیچے دوڑے سبوسو کرتے
 خراب گردشِ دوراں کی آہرد کرتے
 سب کی طرح بھٹکتے جو جستجو کرتے
 نسیمِ صبح کے بچو میں غفلت گو کرتے
 ہم نہیں یوسف کہ عذرا پاک دلائی کریں
 یادِ جوشِ ربایاں بہت سالہ کریں

کسے طوطیوں کی طرح بولتے رہے
جیسے کسی کا بند تھا کھولتے رہے
راؤں کو جو سرور میں ہم بولتے رہے
اسرا کرتے راز میں پر تو لے رہے
ہم اس میں نورِ صبح ازل گھومتے رہے
تنبہ زلفِ اہویشاں دہلتے رہے
خطِ سبوح کو کون دسکاں ڈالتے رہے
اس نے کہا، یہ رات سپردِ تباہی کرو
اس نے کہا، تعاقبِ لاکرِ رُخاں کرو
اس نے کہا کہ نذرِ زلیخا و مشاں کرو
اس نے کہا، مشربِ طے نکال کرو
اس نے کہا، وظیفۂ اہمِ بستاں کرو
اس نے کہا کہ آرزو سے راگیاں کرو
اس نے کہا کہ از سر نو امتحان کرو
اس نے کہا، اس میں چینی دجیاں کرو
اس نے کہا کہ خدمتِ پیرِ مغان کرو
اس نے کہا کہ ترکِ رسومِ جہاں کرو
اس نے کہا کہ اور اسے سرگزاں کرو
اس نے کہا کہ ہم سے نہ دل بدگماں کرو
اس نے کہا، یہ بات یہاں کم بیاں کرو
اس نے کہا کہ دلتِ مدعا نیاں کرو

کس چال یا سبکی کیا تھا کہ ویر تک
کسی کا معاملہ مسئلہ زندگی میں لطف
تا صبح جبریل کو ازبرِ تحارفِ حرف
کل شب ہمارے ہاتھ میں جیسا کہ جو رہا
ہر شب شہِ سیاہ تھی لیکن شراب سے
ہم متقی شہرِ خرابات، رات بھر
اہلِ رات میکشوں نے تو ازل جو کھودیا
میں نے کہا کہ حلِ مقام سے جہاں کرو
میں نے کہا، بہا پر ابد کا کوئی سراغ ؟
میں نے کہا کہ یوسفِ دلِ ناخبریدہ ہے
میں نے کہا کہ فاضلِ شوق ہے عظیم
میں نے کہا، کشایشِ مشکل ہو کس طرح ؟
میں نے کہا کہ صرفِ دلِ راگیاں ہے کیا ؟
میں نے کہا کہ عشق میں بھی اب مزائیں
میں نے کہا کہ بابِ مشیت میں کیا ہے حکم !
میں نے کہا کہ اور کوئی پسندِ خوشگوار ؟
میں نے کہا کہ اخیر بھی ہے رسمِ شہر بھی رسم
میں نے کہا کہ ہم سے زمانہ ہے سرگراں
میں نے کہا کہ رُخ سے استعارہ نقابِ راز
میں نے کہا کہ زبردِ سراسرِ فریب ہے
میں نے کہا خزل نے پچھا یا ہے خزانِ لطف

میں نے کہا کہ حدِ ادب میں نہیں ظفر

اس نے کہا، نہ بند کسی کی دباں کرو

عبدالستار صدیقی پروفیسر

۱۸۸۵ء میں سندیلہ (ضلع برہوئی سرحد) میں پیدا ہوئے تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم گلبرگہ اور حیدرآباد میں ہوئی۔ ہائی اسکول کے بعد ایم۔ اے، اوکالج، علی گڑھ میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۸ء میں الزا آباد یونیورسٹی سے بی۔ اے کی سند لی جس سے یہ کالج اس وقت ملحق تھا۔ دو سال تک اسکول کی طائرت کرنے کے بعد وہ دوبارہ علی گڑھ پہنچے اور یہاں ایم۔ اے (عربی) کے درجے میں داخل ہو گئے۔ اس زمانے میں یہاں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر جوزف مورڈوئر (ف، فریکفرٹ، ۵ فروری ۱۹۳۱ء) لڑی پڑھاتے تھے۔ صدیقی صاحب اپنی قابلیت اور عربی سے فطری مناسبت کے باعث جلد ہی استاد کے جینے میں گئے۔ ۱۹۱۲ء میں ایم۔ اے اس امتیاز سے پاس کیا کہ انھیں یورپ میں عربی کی اہل تعلیم حاصل کرنے کے لیے حکومت ہند کی طرف سے وظیفہ ملا۔

۱۹۱۳ء میں جرمنی گئے یہاں انھوں نے سٹراس برگ اور گینگن کی یونیورسٹیوں میں مشہور زمانہ مستشرقین فولڈیک، تھمب، ایٹمن اور آندریاس کی نگرانی اور رہنمائی میں عربی کی تعلیم پائی۔ اسی تعلیم کے تمام مراحل کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اگست ۱۹۱۴ء کے آغاز میں پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی جس میں ایک فریق جرمن تھا اور دوسرا انگلستان چونکہ صدیقی صاحب برطانوی رعایا تھے، اس لیے ان کی نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی اور ان کا جرمنی سے باہر جانا ممنوع قرار دے دیا گیا۔ یوں انھیں ۱۹۱۹ء تک جبراً جرمنی میں رہنا پڑا۔

ایسے حالات میں انسان بالعموم ایسی اور کالی کا شکار ہو جاتا ہے لیکن صدیقی صاحب

پہر حصولِ علم کا جوشہ خڑو چکا تھا، اسے جنگ کی ترشی نہ اٹا سکی۔ انہوں نے جرمنی میں اس جبری قیام کے زمانے میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھی۔ پہلے ۱۹۱۶ء میں لاطینی زبان کا امتحان پاس کیا، پھر ۱۹۱۷ء میں گیمینگن یونیورسٹی سے خاص امتیاز سے ڈاکٹریٹ کی سند لی۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا: کلاسیکی عربی میں فارسی کے فخیل الفاظ۔ انہوں نے اسے جرمن زبان میں قلمبند کیا تھا، اور یہ اکی زمانے میں جرمنی میں چھپا تھا۔

۱۹۱۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور ۱۹۲۰ء کے شروع میں ایم۔ اے، او کالج، علی گڑھ میں عربی کے ریسرچ پروفیسر مقرر ہو گئے۔ لیکن انہوں نے یہاں مشکل سے آٹھ نو مہینے کام کیا ہو گا کہ حیدر آباد سے دعو تنامہ آگیا۔ یہ وہاں پہنچے اور ستمبر ۱۹۲۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج (کلیہ جامعہ عثمانیہ) کے پرنسپل بنا دیے گئے، جو اس سے سال بھر پیشتر اگست ۱۹۱۹ء میں قائم ہوا تھا۔ یہاں وہ چار برس ۱۹۲۳ء تک رہے۔

۱۹۲۳ء میں وہ حیدر آباد سے ڈھاکہ یونیورسٹی کے بلاوے پر شعبہ عربی و علوم اسلامیہ کے صدر بن کر وہاں چلے گئے۔ وہ ڈھاکہ ہی میں تھے، جب انہوں نے بمبئی یونیورسٹی کی درخواست ہندوستان کے مسئلے پر پانچ دس خطبات دیے تھے۔

ڈھاکہ میں تقریباً چار برس کے قیام کے بعد وہ ۱۹۲۸ء میں صدر شعبہ عربی و فارسی کی حیثیت سے الہ آباد آئے۔ اسی زمانے میں صوبہ متحدہ کی حکومت نے الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی قائم کی اور اکیڈمی کی طرف سے ایک تہائی رسالہ بھی ہندوستانی نام کا جاری ہوا۔ اپنی منصبی تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ، ڈاکٹر مدتی ان دونوں کے بھی رواج رواں تھے۔ وہ دونوں اکیڈمی کی مجلسِ عاملہ کے بھی رکن رہے۔ ان کا آل انڈیا اور ٹیلی کالفرنس سے بھی بہت پرانا تعلق تھا؛ وہ دس برس تک (۱۹۳۳ء۔

۱۹۳۲ء) اس کی عاملہ کے رکن رہے۔ اور انہیں لسانیات کے تو وہ بائیوں میں سے تھے۔ الہ آباد آنے کے بعد وہ کہیں اور نہیں گئے۔ طویل اور کامیاب دورِ وزارت

کے بعد ۱۹۴۶ء میں وہیں ملازمت سے سبکدوش ہوئے، تو الہ آباد یونیورسٹی نے انہیں اپنا پروفیسر ہندو فیس مقرّر کر دیا۔ اب انہوں نے پہلے الہ آباد کے وظائف کی بستی راجہ پور ہی میں گنگا کے کنارے ایک وسیع اور پُر فضا مکان تعمیر کر کے وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ الہ آباد کے بڑھنے سے راجہ پور اب شہر کا ایک محلہ بن گیا ہے۔

ان کی طویل علمی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ نے انہیں سند امتیاز اور خلعت اور دفاعی ہزار روپیہ سالانہ کا عین حیات وظیفہ دیا۔ یہ انہیں راشٹری بھون کی ایک خصوصی تقریب منعقدہ ۲۸ اپریل ۱۹۶۲ء میں عطا کیا گیا تھا۔

مئی برس سے تندرستی بہت خراب پل آ رہی تھی۔ آخری تین چار برس میں حافظہ بالکل جواب دے گیا تھا؛ بلکہ ہوش و حواس بھی مافوق ہو گئے تھے، جس سے یہ علم و فضل کا پتلا اور باغ و بہار شخص جس پر روح ہو کر رہ گیا تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اہل انجام اب بہت دور نہیں ہے۔ اس کے باوجود جب خبر ملی کہ ۲۸ جولائی ۱۹۷۲ء شب کے ساڑھے نو بجے ان کا الہ آباد میں انتقال ہو گیا، تو دل کو دھچکا لگا۔ اتنا درد اتنا ایسا بھون۔ جنازہ اگلے دن ۲۹ جولائی کو اٹھا؛ اور انہیں راجہ پور کے قبرستان میں جو نیا وہ گادول سے ملحق ہے، سپرد خاک کیا گیا۔

اولاد جسمانی میں دو بیٹے اپنی یادگار چھوٹے، محمد مسلم اور محمد زبیر، محمد مسلم صاحب یہاں ہندوستان میں ہیں، الہ آباد میں رہتے ہیں۔ چھوٹے محمد زبیر پاکستان چلے گئے، وہاں کراچی میں قیام ہے۔

ان کی علم و ادب سے عموماً اور اردو سے محبت خصوصاً کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے بانیوں میں تو نہیں تھے، لیکن اس کے استحکام اور ترقی اور کامیابی میں ان کا بہت ہاتھ تھا۔ وہ اردو کے پُرجوش اور سرگرم حامی تھے۔ اور آج کل کے سہل انگار اور مغرب زدہ اصحاب علم کے شیوہ عام کے خلاف تقریر و تحریر میں بے فروخت انگریزی الفاظ کے استعمال کے سخت

مخالف تھے۔

انہیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ پڑھنے والا ان کی تحریر کو ٹھیک پڑھے اور اسے صحیح تلفظ میں کوئی دقت نہ ہو۔ اسی لیے وہ اپنی ہر ایک تحریر پر غلوں سمیت اطراف سے مزین کرتے تھے۔ اٹلا میں ان کے بعض اصول تھے جن پر وہ سختی سے کاربند رہے۔ انہیں ترقی اردو نے ۱۹۲۱ء میں اٹلا کے قاعدے وضع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولوی عبداللہ (ف، اگست ۱۹۶۱ء) نے ملک کے اہل علم کی راے اور مشورہ معلوم کرنے کے لیے ان کی خدمت میں ایک سوالنامہ بھیجا۔ آخر میں جن اصولوں کا فیصلہ ہوا، وہ ڈیٹر مندرجہ ذیل صاحب کی آرا پر مشتمل تھے۔ یہ فیصلہ انہیں کے تباہی رسالے اردو میں شائع کر دیا گیا تھا۔ (اردو ۱۹۲۲ء) ۳: ۵۸۱ (۱۹۲۲ء) انہوں نے اس سے بے اعتنائی برتی اور اس پر عمل نہیں کیا۔ لیکن اس کے بعد کم از کم انجمن کی مطبوعات اسی اصول کے مطابق چھپتی رہیں۔

ڈاکٹر مندرجہ ذیل تقریباً تمام سامی زبانوں پر حاوی تھے۔ ان کے علاوہ یورپ کی بعض زبانیں بھی جانتے تھے۔ ان کا علم و فضل اور وسیع مطالعہ ہر ایک متلاشی علم کی خدمت کے لیے ہمیشہ حاضر رہتا۔ کوئی صاحب اپنی تصنیف کے لیے کسی قسم کی معلومات طلب کرتے۔ وہ گفتگوں اپنے کتابخانے میں مطالعہ کر کے موضوع سے متعلق مواد جمع کرتے اور اسے پوری تفصیل اور وضاحت سے قلمبند کر کے سائنس کو پیش کر دیتے۔ کوئی دوسرے بزرگ اپنی تصنیف ہدیہ بھیج کر اس کے بارے میں ان کی راے معلوم کرنا چاہتے۔ وہ کتاب کو طور سے پڑھ کر صرف موضوع ہی سے متعلق لکھتے، بلکہ اٹلا، اطراف، کتابت اور صفحوں کے اخلاط تک کی نشاندہی کر دیتے۔ میں نے بعض اصحاب کے پاس ان کے ۲۰-۲۵ اور ۲۵-۳۵ صفحات کے، بلکہ اس سے بھی طویل تر خط دیکھے ہیں۔ کہاں لکھتے اب ایسے اصحاب جن کا اور نہ بچونا اس حد تک خالص علم ہی ہوگا! کاشیکہ کوئی الہ کا بندہ ان کے خطوط جمع کر کے شائع کر دے، اے یہاں معلومات کا خزانہ ہونگے یہ۔

افسوس، ان کی کوئی قابل ذکر مطبوعہ کتاب نہیں ملتی۔ ان کا انفاست اور تکمیل کا معیار اتنا بلند تھا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق نہ کوئی کام پورا کر سکے، نہ اس کی طباعت سے مطمئن ہوئے جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے مسودات میں دیوان بیان اور نامہ غالب کے مکمل مسودے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بیش قیمت مضامین کی بڑی تعداد مختلف رسائل و جرائد میں بکھری پڑی ہے۔ اگر انہیں بھی جمع کر کے ایک دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے، تو کیا محجوب کہ یہ اس دیرینہ خادمِ علم و ادب کا نام آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کا ذریعہ ثابت ہوں۔ رہے نام الہ کا۔

تاج قریشی حیدر آبادی، محمد تاج الدین

۱۰ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ (۲۷ اپریل ۱۹۱۲ء) کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد امیر الدین قریشی پانچاچا، سماںجاہی کی فوج میں کپتان تھے؛ اور خود بھی چھوٹے موٹے جاگیردار تھے۔ اس لیے تاج کو یاسمن میں چاندی کا چھپے پیدابوٹے، جس سے ان کا بچپن اور جوانی کا زمانہ بیفکری اور بچسدر آرام و آسائش میں بسر ہوا۔ اردو اور فارسی کی حد تک تعلیم بھی گھڑی پر ہوئی۔

شعر گوئی ۱۷ برس کی عمر میں شروع کی اور اس میں سید علی احمد نیرک تنوچی (ف ۱۹۳۱ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد نادر علی برتر سے سلسلہ تلمذ قائم کیا۔ برتر خود نواب میرزا ظہیر دہلوی (ف مارچ ۱۹۱۱ء) کے شاگرد تھے۔ اس طرح وہ ذوق کے خاندان میں شامل ہو گئے۔

ان کا ابتدائی زمانہ جس عیش و عشرت میں گذرا تھا، آخری اتنا ہی مسرت اور کلفت میں بسر ہوا۔ منصب داری اور جاگیر ختم ہوئی، تو اسی کے ساتھ آمدنی کے تمام ذرائع بھی مسدود ہو گئے۔ اور کوئی کام کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جسم و جان کا رشتہ بجال رکھنے کے لیے رفتہ رفتہ اثاثا بیت تک فروخت ہونے لگا؛ اور بالآخر انھیں اپنے وسیع جدی مکان سے اٹھ کر ایک دوسرے محلے میں چھوٹے سے مختصر مکان میں جانا پڑا۔ ان سلسل مشکلات کے باعث صحت مستقلاً خراب رہنے لگی۔ دوستوں اور مداحوں نے کچھ خبر گیری ضرور کی، لیکن بے در پے ذہنی اور جسمانی پریشانیوں نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا۔

پرائی شخص کی شکایت نے شدت اختیار کر لی، تو آؤ لا گھڑی پر علاج شروع ہوا! لیکن جب سلسلہ کئی مہینے کی دوا و دوش کے باوجود افاقے کی کوئی صورت نظر نہ آئی، تو سب طرف سے ایوس ہو کر دواخانہ عثمانیہ (حیدر آباد) میں داخل ہو گئے۔ وہیں منگل، ۵ ستمبر ۱۹۷۲ء دن کے ساڑھے دس بجے جان بحق ہوئے۔ تجہیز و تکفین بھی اصحاب نے کی۔ اسی دن نماز مشاک کے بعد درگاہ حضرت درہنہ شاہ کے قریبی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔

افسوس، ان کا مجموعہ کلام زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ ۵۰ برس میں جو کچھ کہا، اور یہ خاصی مقدار میں ہے، ان کے خاندان میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری مرحوم (ف ۱۹۶۲ء) نے اپنی زندگی میں ان سے خاص طور پر منظم تاریخ و مکتبہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ دراصل انہوں نے اس طرح بالواسطہ ان کی مالی امداد کرنے کا بہانہ پیدا کرنا چاہا تھا۔ لیکن تاج ان کے جیسے ہی کام شروع نہ کر سکے۔ شرط یہ تھی کہ ہر مہینے کم از کم ۵۰ اشعار ضرور کہیں گے، جن کے لیے ادارہ ادبیات اردو (حیدر آباد) کی طرف سے ان کی خدمت میں پچاس روپے پیش کیے جائیں گے۔ تاج نے کام زور کی دہشت کے بعد شروع کیا اور ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار اشعار کہے۔ یہ دراصل دو طویل تفلیں ہیں۔ عہدِ قطب شاہی سے متعلق کوئی پانسو شعر ہیں، جن کا تاقیہ عیار، شعار و نیزہ ہے۔ بعد کے زمانے کے بارے میں گیارہ ہزار شعر ہوئے؛ یہ دعا، کہا، گیا کی زمین میں ہیں۔ افسوس کہ اس کے بعد جلد ہی خود ادارہ ادبیات اردو کی مالی حالت بہت کمزور ہو گئی اور اس میں تاج کو ماہانہ وظیفہ ادا کرنے کی استطاعت ہی نہ رہی۔ اس پر انہوں نے کام بند کر دیا۔ بہر حال اس نامکمل منظوم تاریخ کا مسودہ ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانے میں موجود ہے۔

تاج قدیم وضع کے پختہ گوشاعر تھے۔ لیکن جدید خیالات سے کبھی بھڑکے نہیں تھے۔ خود ان کی اپنی غزلوں میں بہت سی سیاست کی طرف تک اشارے ملتے ہیں۔

حیدر آباد میں، ان کے والدین اور دوستوں کا جو چراغ روشن تھا، وہ ان کی دلالت سے گل ہو گیا۔ چوں کہ ان کے کلام کا لونی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا ہے، مشکل سے چند شریعتی بڑے بیٹے - لائبریریوں،

اشتی ہے دل میں ہوک سی، ہوتا ہے اختلاج سا
پچھلے دنوں نہ تھا کہیں حال نہ سب آج سا

کیسا کمال ان کے غزل نگ نظر میں ہے : تھا ان کے پاس ابھی، ابھی یہ بچہ بگڑی ہے
کیا بنا۔ نہ ان کے۔۔۔ وکرم کے مقام کو واظنا کہی تو مسئلہ غیر دشمن میں ہے
معنوں بلکہ کہ : نہاں میرا ہرگز نہیں تھا شان کلام حضرت برتر نظر میں ہے
سوئی گرداب : رنگ سے گریزاں ہو کر سر کو نکراتی ہے ساحل سے پریشاں ہو کر

بلاشتاقی فطرت کیسے رہتی ہے طوفاں سے
مصائب دوست انگریزین کی نہیں کرتی میں ساحل کا
طوفانی سلامت، بات درگاہی میں نے ساتی کی
انکا پایا جام یوں ہنس کر کہ سب لبریز ہی سمجھے
شیع کے دل میں : بنا اخلاص، نہ الفت، نہ گداز
صرف احرام ہی احرام ہے، کیا عرض کریں

تصویرت شمشاد چہ، لب غنچہ، وہیں پھول سرتا بقدم میں، وہ بیارادہم رتن پھول
پاپوں کا چٹ شکوہ، نہ غنا دل کی شکایت میں عالی پابندی آئین چمن پھول
تکلیف ہی پائے : تو نہیں ہوتی گو پاس وفا سے میں معصوم چمن پھول
پروردگار آئے : بہاراں میں یہ دونوں میں فخر چمن خار، تو میں تازہ چمن پھول

نہیں کہتی ہیں کانٹے سے غم و آلام کی گھڑیاں
وہ دیکھا ہے کہ پیر لنگے ہیں عشرت کے زمانے کو
جن میں میں بھی رہتا تھا، چمن میں وہ بھی رہتے تھے
گھٹاں کو میں دوتا ہوں، غنا دل آشیا نے کو

چمن کا جسم وہی داغدار و خاکب آلود
 گلوں نے چھیڑ دیا جب خزاں کا افسانہ
 یونہی رہا جو چمن میں فلک خلل انداز
 فریب خوردہ رنگ چمن سمجھتے ہیں
 ہے کس لیے غم خیز یہ گلستاں بیل!
 لیا گیا کیا اسے نفاذ چمن کا مسز
 فضا میں ہے میں حاضر ہوں، آپ بھی کہیں
 نقش میں آئیں، رنگینی چمن کھنچ کر
 ہر شام نیاز و پ ہے ہر صبح نیاز و نگ
 جو سینہ سپر ہوتے ہیں پورش پہ خزاں کی
 ہر ایک سے یہ بار اٹھا یا نہیں جاتا
 رہتے ہیں خوشی میں بھی جو یہ چاک گریباں
 بن جاتے ہیں وہ از غم ہساروں کے دیو کا
 ہے اس کے سینے میں کھٹوں کی آبر و نہاں
 خرم میں تویر میں، ہر ایک جانیں بکاتا
 تھکن شام غم کے قرباں یقین روشنی سلامت!
 افق سے اب پھوٹتی ہیں کوئیں اور گی کیا تیرگی سلامت

ایک دنیا ہے اسی دل کی دولت ڈالیں،
 آنکھ میں جس کی مروت نہ بھرت دل ڈالیں،
 پہچانتی ہے خوب تیری رنگدہر سے مجھ
 تھی کس قدر اسیدِ نمونو سحر سے مجھ!
 تو یہ سمجھتی ہے دنیا کہ دل میں درد نہیں
 خزاں کی رشت میں بھی رخصت ہو کر نہیں

رکھے آباد خدا امیری تستاؤں کو
 کس قسم نکیش کو الے تاج! دریا دل تھپے
 برسوں دیا ہے آبلہ پا کاخوں اسے
 دن میں بھی پھر دی ہے اندھیراں کا باغ
 فغان گرم، لہو ہوش، آو سر و نہیں
 مہن تو بچھا، اہمستان، لہاں رکھتے ہیں

مذکرہ سامعین

مردِ وفا میں ہے پہل کا اس قدر اقلاس
 کہاں کے نقشِ قدم اتنا فلی کی گرد نہیں
 آج بھی اس کے سمجھے کوڑیں حیراں کتنے
 آدھی کتنے ہیں اس دور میں انساں کتنے
 بھول ہیں عشرتِ یک لمحہ پر شاداں کتنے
 یہ ہیں نادانِ اہتمامِ گلستاں کتنے !
 سو زولِ سناںِ الم، نغمہاں، کیفِ حیات
 ایک افسانہٴ لغت کے ہیں حزاں کتنے !
 یاد کر کے تجھے آخر شبِ ڈوب گئے
 جھلا تے ہوئے تاجِ سرِ شرکاں کتنے !
 کہیں حقیقتِ جلوہ کی اک جھلک نہ ملی
 بہ زعمِ دانشِ دُعاں بہت دماغِ بھلے
 ایسا بھر کے کرو عاقبتِ طلبِ رندوں
 دماغِ بھول ہوا کرتی ہے چراغِ بھلے
 کچھ اس ارادے ہوئے جلوہ گروہِ محفل میں
 کسی چراغِ بجھے، اور کسی چراغِ بھلے
 حدیثِ ہند چھڑے، ذکرِ تاشقند چلے
 بعدِ غلوں، بہ اندازِ دلہند چلے
 دیارِ عشق میں یوں ان کے غم پسند چلے
 سپاہِ میسے کہیں ہو کے قہقہہ چلے
 روحمات میں اکثر قسید آئے، مگر
 بلند حوصلہ، ہر وقت سر بلند چلے
 کوئی محزونِ محبت کی راہ کیا رو کے !
 کچھ اس کے آگے نہ آئیں قید و بند چلے
 کہ یہ تغیرِ نظرت بھی ایک لمحہ فکر
 کہ شری کمت رہ کیوں عاقبت پسند چلے
 حرمِ ناز میں بھی نقشِ باپا ملک اٹھے
 کچھ ایسی شان سے تیرے نیاز مند چلے

وہی جہانِ وفا کے میں شہرِ راز اے تاج !

جو درد مند رہے، اور درد مند چلے

مختار صدیقی، مختار الدین

ان کا خاندان سیالکوٹ پاکستان، کارہنہ والا تھا، جہاں وہ یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ لیکن ان کی صغر سنی ہی میں ان کے والد نقل مکان کر کے گوجرانوالہ چلے آئے تھے۔ اسی پے مختار الدین صاحب کی تعلیم گوجرانوالہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے بی۔ اے کا امتحان اسلامیہ کالج، لاہور سے پاس کیا۔

ملازمت کا پورا زمانہ ریڈیو کی ملازمت میں گزرا۔ اولاً آل انڈیا ریڈیو میں اسٹنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوئے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد اسی عہدے پر ریڈیو پاکستان چلے گئے۔ جب وہاں ٹیلی ویژن کا شعبہ قائم ہوا، تو اس میں مضمون نویسی کا کام ان کے سپرد ہوا۔ اسی عہدے پر اپنی موت تک کام کرتے رہے۔

قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا جس پر انھیں نوحی اسپتال، لاہور میں پہنچا دیا گیا۔ آٹھ دن وہاں رہے اور کچھ افاقے کے آثار نظر آنے لگے تھے کہ ۸ ستمبر ۱۹۷۲ء کو یکایک پھر شدید ملل ہوا۔ اسی دن ساڑھے آٹھ بجے شام انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن (۹ ستمبر) انھوں اور انھیں قبرستان اہقرہ (لاہور) میں سپرد خاک کیا گیا۔ سات کے قلمی سے تاریخ ہوئی:

از سر زخم دلم تاسخ و ملش شد رقم جوں من شنیدم: راہی ملک بدم مختار شد
(۱۹۷۲ = ۱۹۷۵ + ۷)

اپنے پیچھے جسمانی یادگار دو لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑیں۔

انھوں نے علم و ادب کی بڑی قابل قدر خدمت کی ہے۔ ابتدا میں انھوں نے

سیاہ اکبر آبادی سے اصلاح لی تھی۔ وہ بیگ وقت شاعر اور ادیب اور نقاد تھے۔ انھوں نے بھی میراجی کے ساتھ حلقہٴ اربابِ ذوق، لاہور میں نئے نئے تجربے کیے، جو اگرچہ نہ سب کا مایاب ہوئے، نہ انھیں پسندِ عام کی سند ملی؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھیں تجربوں کی بدولت اردو شاعری میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔

انہر تصوف اور خاص کر حضرت سلطان باہو کا بہت اثر تھا۔ کلاسیکی موسیقی میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ چنانچہ ان کی شاعری میں اس کے آثار بہت نمایاں ہیں۔ ان کا مختصر مجموعہٴ کلام ”منزلِ شب“ (لاہور ۱۹۵۵ء) ان کے آہنگ کا نمایندہ ہے۔ اس میں بیشتر نظمیں لغگی کی فضا اور تانگی کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے چینی الاصل امریکی مصنف ہنریو تانگ کی مشہور کتاب کا ترجمہ بھی ”چینی کی اہمیت“ کے عنوان سے کیا تھا۔ ممکن ہے، کچھ اور تصنیفات بھی چھپی ہوں جو میری نظر سے نہیں گذری ہیں۔ انھیں اپنی لیاقت اور صلاحیت کا شاید احساس تھا، اور اس بات کا افسوس کہ زمانے نے ان کی کماحقہ قدر نہیں کی۔ روایت ہے کہ موت سے چند دن قبل ایک دوست مزاج پُرسی کو گئے، تو ان کے حال پوچھنے پر میر کا یہ شعر پڑھا:

ایک محروم پھرے، میرا ہیں دنیا سے وہ نہ عالم کو زمانے نے دیا کیا کچھ

یہ چند شعرا ان کے مجموعےٴ منزلِ شب سے لیے گئے ہیں :

دیکھیں، بیتاب رہینگے کب تک۔! چین دل کو کسی عنوان نہ سہی

دھشتِ آشمار، دردِ بام ہیں کیوں! یہ مرا گھر ہے، ایسا باں نہ سہی

موت کو زلیست ترستی ہے یہاں موت ہی کو نسی سستی ہے یہاں

سب خرابے ہیں تمناؤں کے کون بستی ہے جو بستی ہے یہاں

ہم ہی تو تھے میںِ نوات، لیکن ہونا، ہوا سنگِ راہ اپنا

نہم کی اس بیزاری کی کا کچھ تو ہو صلاح ہم نہیں کہتے کہ ان سے ہی ملاقاتیں کرو

آنکھ پر آشفۂ خیالی، کس کو بھلا خوش آتی ہے !
 جی مانے، تو ہم بھی کچھ دلجمعی کا سامان کریں
 جب سے نفس کا گوشہ چھوٹا، ایک ہی دُگدہ رہتی ہے
 جیسا مشکل، مرنا مشکل، کیا مشکل آسان کریں
 میل ملاپ کی باتوں میں، اب سوچتے ہیں دلہنیں
 شاید یہ معلوم ہو کہ ہم کو خوئے فراق ہوئی
 دل ہی کے دم تک غم کر جیسے کے سارے جھگڑے تھے
 ارے قصہ پاک ہوا ہے، جھوٹے سچے سہاروں کا
 تیزی لگن کے لاگ، کسے ہاتھوں ہم بچیں کمال ہوئے
 جتنے ارماں بنیں رہے، وہ اپنے جی کا وبال ہوئے
 آج کی بات نہیں، ان حالوں ہم کو برسوں گزرے ہیں
 جوں توں ملے، نگہ زاری لیکن دن کو سوا بحال ہوئے
 شانِ خدا ہے آج زمانہ آیا ہم بے ہنزدوں کا
 ورنہ اس اک بستی میں بھی کیا کیا الہا کمال ہوئے !
 گلیاں وہ مسنان ہیں، جزیں میں تیرا روانہ پھرتا ہے
 اس کے بہانے دید کو تیری، سارا زمانہ پھرتا ہے
 لکوں ملکوں شہروں شہروں، اپنے غم کی شہرت تھی
 یوں دہرہ دہرہ محفل محفل، تیرا فسانہ پھرتا ہے
 ساحل پر کیا بچے ہم، طواری سننے ترکیبوں کے
 پہلے یہ شکستہ کشتی تھی، اور طوفانوں کے لیے تھے
 دل زدگاں کے دورے پہلے، دنیا رستی رستی تھی
 پھر کچھ ہرچے ایسے پہلے، جین کسے آرام کہاں !

تھی تو سہی، ہر آج سے پہلے ایسی حقیر تفسیر نہ تھی
 دل کی شرافت، ذہن کی جودت، اتنی بڑی تفسیر نہ تھی
 سچ کہتے ہو، ہم ایسے کہاں، اور سوز و گداز شوق کہاں!
 سچ ہے، مرے آئینہ دل میں کوئی "بکھی" تصویر نہ تھی
 یہ تسلیم بے گناہ ہے گا ہے کچھ دلچسپی رہتی ہے
 درتیری دنیا میں بھی، کوئی ہیں آرام نہیں
 سچ کہتے ہیں منزل والے، ہم میں گداز شوق نہ تھا
 سچ ہے، انھیں کے اشک تھے موتی ان کی آپہنٹیں
 اب کچھ بھی نہیں ہیں، یعنی اگر درویشیوں میں بیٹھے ہیں۔
 دن وہ تھے، جب اپنے بھی سر پر ٹیڑھی ترجمی کلاہیں تھیں
 نکتہ دروں نے ہم کو کجایا، خاص بنو اور عام رہو
 محفل محفل صحبت رکھو، دنیا میں گمنام رہو
 یہ بھی کراست ہوگی شاید اس اقدار طبیعت کی
 درد نہ دل سے کس نے کہا تھا، یوں مغموم مدام رہو

پنہاں بریلوی، سپہر آرا خاتون عرف رابعہ

بریلی کے ایک سربراہ اور دہ علمی خاندان کی چشم و چراغ تھیں۔ ان کے والد بریلوی عبد اللہ صاحب کا شہر کے معزز لوگوں میں شمار تھا، ان کی سکونت گھر عبد القیوم خان محلہ شاہ آباد (بریلی) میں تھی۔ مولوی عبد اللہ خاتون ڈاکٹر سررشتہ، تعلیم الہ آباد کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ رہے۔ ان کی چار صاحبزادیاں تھیں، اور حسن اتفاق سے چاروں شاعروں: بڑی آمنہ خاتون، حفیظہ، بہمنعلی سپہر آرا خاتون عرف رابعہ پنہاں، بہمنعلی بلقیس جمال جمال و جمال سب سے چھوٹی حسن آرا بیگم عرف سمیوہ کا تخلص غزا لہ تھا۔

سپہر آرا رابعہ پنہاں ۷ اگست ۱۹۰۶ کو صہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ ان کی تعلیم ہر گھر پر اور وہ بھی میٹرا اپنے والد سے ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اردو اور فارسی کے بعد انگریزی بھی پڑھی۔ چونکہ گھر کا ماحول علمی تھا، اس لیے ان کا اس سے متاثر ہونا لازماً تھا۔ انہی کم عمر تھیں کہ اردو میں مضمون لکھنے لگیں۔ مولوی برس کی تھیں کہ شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا، تو پہلے کوئی سال بھر کے لیے، ماجد علی صاحب سے اور بعد کو طالب علی طالب آبادی (ایم۔ اے۔ ایل ایل بی، ایڈووکیٹ، الہ آباد) سے مشورہ رہا۔ جلد ہی طالب صاحب نے نظم و نثر میں فارغ الاملا قسرا ر دے دیا۔

۱۹۲۵ء میں مولوی عبد اللہ کا انتقال ہو گیا، جس کے بعد خاندان کو الہ آباد کی سکونت ترک کر کے واپس آبائی وطن بریلی آنا پڑا۔ تین سال بعد ۱۹۲۸ء میں اپنے ایک قریبی عزیز مصوفی صغیر حسن صاحب نے نرسنگ اسکول کالج، الہ آباد

سے عقیدہ نکاح ہو گیا۔ فرشتہ قسمتی سے وہ بھی علمی مذاق کے تھے، اس لیے ہر طرح سے
۱۰۰ کے فوق کی تکمیل و ترقی میں معاون ثابت ہوئے۔

آئینہ ہم نامک کے بعد غاندھان سمیت پاکستان چلی گئیں اور کراچی میں سکونت اختیار
کر لیں۔ وہیں پیر کے دن ۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو انتقال ہوا۔

پتہ ماں نورا پند و والد (مولوی عبدالاحد) سے شدید محبت تھی۔ ۱۹۲۵ء میں انھوں نے
ریاضت کی، تو اس سانحے کا انھیں بہت صدمہ ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں
نے بہت تطہیں بھی تھیں جن کا مجموعہ 'اشکِ خورشید' کے عنوان سے ۱۹۲۹ء میں شائع
ہوا۔ اس صدی کے چوتھے اور پانچویں دہے میں یعنی تقسیم ملک سے قبل ملک ان
کا کلام ملک کے بیشتر رسائل و جرائد میں کثرت سے چھپتا رہا ہے۔ وہ اردو کے
علامہ فارسی میں بھی خوب کہتی تھیں، نظم و نثر دونوں پر یکساں تدرت حاصل تھی۔
نثر اور نظم اور افسانہ ان کے خاص میدان تھے۔ غرض خوش فکر اور خوشگو شاعرہ
تھیں۔ کلام میں پختگی اور جذبات کی عکاسی ہے۔ افسوس کہ کلام کا کوئی مطبوعہ
مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا۔

تلاش سے جو چند شعر دستیاب ہوئے، نذر ناظرین ہیں،

میں اک طرف ہوں، شکلِ خزاں پایہ سالِ یاس	اک سمت وہ بہار کا جلو ایسے ہوئے
عشقِ جنوں تو از چلا، بزمِ ناز میں	اک اضطراب و شوق کی دنیا ایسے ہوئے
میری تو ہر نگاہ ہے وقفِ مہر و ریت	وہ ہر ادا میں حسنِ کلیسا ایسے ہوئے
میرم سے بلے نیا نہیں پنہاں! یہ خیمِ دل	کیا کیا فسوں ہے چشمِ دل آرا ایسے ہوئے
دردنی ہے ترے عتاب کا رنگ	شیشہ چشم میں شراب کا رنگ
شیشہ پینا میں پنہاں برق ہے	حسنِ پرفتن آج زیرِ دام ہے
جہیں حسن پر سرخی سی و دڑی	نگاہِ آرزو نے کر دیا کیا
یہ ہر ناہمی بقدر یک نفس ہے	ہماری ابتدا کیا، انتہا کیا
جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں	خدا معلوم ہے رسمِ وفا کیا

حضرت امیر خسرو کی زمین میں فارسی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں :

جمالش زینتِ دل بود، شبِ جاغے کہ من بودم
 بچشمِ دہریاِ طل بود، شبِ جاغے کہ من بودم
 نگاہم بر تجلایِ رُخِ آیینہ رخسارے
 سرمِ برپاے قافلِ بود، شبِ جاغے کہ من بودم
 پُرس اذر بردِ کاملِ طریقِ عشق و الفت را
 سرِ تلوارِ سنبل بود، شبِ جاغے کہ من بودم
 چسانِ دل کو میسازد زیادہ، کیفِ دوشینہ
 دلمِ نخبِ قافلِ بود، شبِ جاغے کہ من بودم
 خطِ رنگین کہ بر پیشانیِ بسمل کشیدہ تیغ
 نشانِ عشقِ کاملِ بود، شبِ جاغے کہ من بودم
 خمِ زلفِ نگارے کردِ پنہاں ! طرفہِ اعجازے
 خیالمِ درِ سلاسلِ بود، شبِ جاغے کہ من بودم

محمد اسماعیل پانی پتی، شیخ

ان کا خاندان اصل میں دلی وال تھا جہاں ان کے والد تجارت کرتے تھے۔ محمد اسماعیل بہرہ دلی (دلی) کے نواحی گاؤں پانی میں ۴ اپریل ۱۸۹۳ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم سراسر دلی میں ہوئی تھی۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں پانی پت منتقل ہو گئے۔

ان کی مکتبی تعلیم کچھ زیادہ نہیں تھی، لیکن وہ صحیح معنوں میں طالب علم تھے۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ جو کئی درسی اور امتحانی تعلیم سے رہی تھی اسے انہوں نے ذاتی مطالعے سے پورا کیا۔ اور اپنی محنت اور سلیقے سے علمی اور ادبی دنیا میں وہ مقام حاصل کیا کہ ان کا ہمارے صنفِ اول کے مصنفوں میں شمار ہوتا تھا۔

انہوں نے ملازمت کا آغاز حالی مسلم ہائی اسکول، پانی پت سے کیا جہاں وہ اردو اور فارسی پڑھاتے تھے لیکن بنجانے کیوں، اس ماحول میں ان کا دل نہیں لگا جلد ہی وہاں استعفیٰ داخل کر کے مقامی ڈکٹوریہ میو ریل لائبریری میں کتابدار مقرر ہو گئے۔ یہاں سے الگ ہوئے، تو مولانا حالی مرحوم (ف ۱۶۱۹۱۳) کے کتابخانے کے نگرہ بن گئے۔ یہاں وہ پندرہ برس تک رہے۔

تدریس نے انہیں صحافی اور مصنف بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم ودیعت کی تھی معنوں تو وہ بہت تھوڑی عمر ہی میں لکھنے لگے تھے، ان کا سب سے پہلا معنون پندرہ برس کی عمر میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے اپنا

واقعہ بہت سہا م جہاں خاکے نام سے پانی پت سے جاری کیا تھا، بعد کو مولوی عبدالجلیلم پانی پتی کے مشورے پر انھوں نے اس کا نام بدل کر "کائنات" کر دیا۔ اس کے علاوہ حالی سلم پانی اسکول پانی پت کے ماہر تھے، مشعل کی ادارت بھی ان کے سپرد رہی۔ انھوں نے یہ سب پرچے اس کامیابی سے چلائے کہ چند سال بعد جب ۱۹۳۲ء میں حکومت پنجاب نے دیہات سدھار کے تحکیم کی سرپرستی میں جنگ (حال پاکستان) سے ایک ہفتہ وار ہرچہ "عروج" جاری کرنے کا فیصلہ کیا، تو اس کی ادارت کے لیے تقریباً ستر امیداروں میں سے شیخ محمد اسماعیل کا انتخاب ہوا۔ شیخ صاحب نے ادارت قبول کر لی، لیکن شرط یہ رکھی کہ میں اس پرچے میں حکومت کی خوشامد نہیں کروں گا۔

یہ پرچہ بہت کامیاب رہا۔ محمد بیٹے بعد لفٹنٹ گورنر میجر سن کے دفتر سے خط ملا کہ لاٹ صاحب تمہارے کام سے بہت خوش اور مطمئن ہیں، تم لاہور آکر سید خوشنودی لے جاؤ۔ شیخ صاحب نے لاہور جانے اور انگریزوں سے سند قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

انگریز کے بارے میں یہ جذبہ مخالفت انھیں اپنے دادا حاجی محمد ابراہیم مرحوم سے وراثت میں ملا تھا۔ وہ اچھے شاعر، اچھے ناثر اور صوفی مزاج بزرگ تھے۔ ان کی پوری زندگی انگریزی راج کی مخالفت میں گزری۔ یہی شیخ محمد اسماعیل کا بھی مزاج تھا، اگرچہ اس کا مظاہرہ عملی سیاست میں نہیں ہوا۔

انھوں نے سب سے پہلے ایک مختصر سارسالہ "ودیباں اور پیدیاں" کے نام سے آل انڈیا محمدان ریجیکیشنل کانفرنس کی فرمائش پر لکھا۔ یہ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا اور اب بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔

وہ حالی اور مر سید کے حالات کے گویا حافظ تھے۔ انھوں نے مولوی عبدالجلیلم مرحوم کے کچھ پمپرسوں کی محنت کے بعد حالی کے مضامین جمع کیے، اور مسودہ مولوی صاحب موصوف کے حوالے کر دیا۔ لیکن جب کتاب چھپی، تو انھوں نے اس پر

شیخ صاحب کا نام نہیں چھا پا، بلکہ دیباچے میں لکھا کہ یہ مضمون کچھ میرے اور کچھ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے جمع کیے ہوئے ہیں، حال آں کہ بقول شیخ صاحب اس میں ان کی طرف سے ایک سطر کا بھی اضافہ نہیں ہوا تھا۔

۱۹۳۵ء میں پانی پت میں حالی صدر الہیاد گارمنائی گئی تھی۔ اس کے محرک بھی دراصل شیخ محمد اسماعیل ہی تھے۔ اس تقریب کی صدارت مرحوم نواب حمید اللہ خان دہلوی سمہوال (ف فروری ۱۹۹۰) نے کی تھی۔ ان کے علاوہ علامہ اقبال (ف اپریل ۱۹۳۸) نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ شیخ صاحب نے اس تقریب کی مکمل ریکارڈ اور ماہنامہ ”تھیاتسٹو“ (پانی پت) میں شائع کی تھی۔ ان کی تصنیف ”تذکرہ حالی“ بھی اسی تقریب کی یادگار ہے۔

تقسیم ملک کے بعد وہ ستمبر ۱۹۴۷ء میں تباہ حال لاہور پہنچے۔ یہاں انہوں نے بسر اوقات کے لیے اپنے معلم کاسہارا لیا اور ماہنامہ ”عالمگیر“ کے مدیر مقرر ہو گئے؛ دو سو روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ لیکن چند ہی مہینے بعد رسالے کے مالک حافظ محمد عالم (ف ۱۶ جنوری ۱۹۵۱ء) سے اختلاف ہو گیا اور انہیں مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد کہیں کوئی ملازمت نہیں کی۔

انہوں نے کم و بیش سو کتابیں تصانیف و ترجمہ کی ہونگی۔ ان میں بعض بڑے سحر کے کی چیزیں ہیں۔ مثلاً انہوں نے سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان کی قریباً بیس پر مقالہ ”سرسید“ (جلد ۱۶) جمع کیے۔ ان کے علاوہ مکتوبات سرسید، مکتبہ حالی، انکارِ سلیم وغیرہ ایسی کتابیں ہیں، جن کے بغیر تاریخ ادب اردو مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے حالی کی سوانح عمری کے لیے وافر مواد جمع کیا تھا۔ تاریخ اسلام کی بھی کئی جلدیں تلمذ کی تھیں۔ مرحوم عقیدے کے لحاظ سے احمدی تھے۔ انہوں نے کچھ کتابیں اس تعلق سے خود بھی تصنیف کی تھیں اور بعض دوسرے حضرات کی بھی شائع کی تھیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی جو کتابیں مسودوں کی شکل میں رہ گئی ہیں، ان کی بھی خاصی تعداد ہے۔ خدا نہ کرے، وہ

ضائع ہو جائیں!

حکومت پاکستان نے ان مسلسل علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں دس ہزار روپیہ نقد انعام اور تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا تھا (۱۹۷۱ء)۔ اس کے علاوہ کئی برس سے انہیں ۲۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ بھی مل رہا تھا۔ غرض مالی پہلو سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لیکن ملک پر تھوڑی سی عافیت بھی نہ دیکھ سکا۔

عمر کے ساتھ مختلف عوارض تو لازماً بشریت خیال کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن جنوری ۱۹۷۲ء میں ان کے بڑے بیٹے شیخ محمد احمد کی عین شباب میں برصِ خفص ناگہانی موت نے ان کی کمر توڑ دی۔ پھر سال بھر بعد بیوی داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان سانحات نے ان کا صبر و سکون تباہ کر کے رکھ دیا۔

آخر عمر میں بہت لاغر ہو گئے تھے۔ حافظہ بھی کمزور ہو چکا تھا۔ اگست ۱۹۷۲ء میں ایک دن بازار میں جا رہے تھے کہ ایک سائیکل سے ٹکرا کر گر گئے۔ اس سے بہت زخم آئے، ہاتھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ جب کسی گھریلو علاج سے فائدہ نہ ہوا، تو میو اسپتال، لاہور میں داخل ہو گئے۔ عملِ جراحی کامیاب رہا، اور کچھ افاقے کے سہارا نظر آنے لگے تھے کہ یکایک فشارِ دم نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ وہیں جمعرات ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۲ء (۳ رمضان ۱۳۹۲ھ) صوبائی پانچ بجے شام راہی ملک بقا ہوئے۔ آقا بہتر و آنا الیہ راجعون۔

سوگواروں میں اپنے پیچھے ایک یٹا شیخ مبارک محمود اور پوتا احمد طاہر (خلیفہ شیخ محمد احمد مرحوم) چھوڑے۔

سید سخی حسن نقوی امرودہوی

امردہہ (ضلع مراد آباد) کے نقوی سادات کے مورث اعلیٰ مخدوم سید خرف الدین شاہ ولایت (ف رجب ۱۲۳۳ھ راکتوبر ۱۸۳۸ء) کے والد میران سید علی بزرگ (پسپو پور قلعہ) دوسری مرتبہ ابجد فیروز شاہ تغلق (اور ایک اور روایت کے مطابق حیات الدین بلبن کے زمانے میں) عراق کے شہر واسطہ سے ہندستان آئے اور امردہہ میں بس گئے۔ امردہہ کی سب سے پہلی تاریخ ۱۸۸۹ء میں ضلع گلزار ابراہیم، مراد آباد سے بعنوان "تاریخ امروہی" شائع ہوئی تھی، جس کے مصنف سید امیر حسین تھے، یہی سید سخی حسن کے پردادا تھے۔ افسوس کہ اس مفید کتاب کا نسخہ اب بہت کمیا ہو گیا ہے۔

سید سخی حسن کے والد مسکری حسن (عرف میر تقی) زمینداری پیشہ تھے۔ ان کا ۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا، امام بارگاہ علی خان (محلقہ گدڑی)، امردہہ میں دفن ہیں۔

سید سخی حسن یکم نومبر ۱۹۱۴ء کو امردہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں امام المدارس ہائی اسکول، امردہہ سے دسویں درجے کی سند حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد گھر کی مالی حالت مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے سازگار نہیں رہی تھی۔ لہذا انھوں نے کچھ کچھ جاواد بیچ ڈالی تاکہ اس سے تعلیم جاری رکھنے کی سہیلگی آئے؛ لیکن افسوس کہ یہ بھی نہ ہو سکا۔ اس پر انھوں نے بمبئی آرٹ اسکول کی سند کا امتحان دیا اور اس میں کامیابی کے بعد اپنے اسکول ہی میں آرٹ ٹیچر مقرر ہو گئے۔ جب دو سال بعد حالات کچھ بہتر ہو گئے، تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

یہاں سے یکے بعد دیگرے بنی اے (۱۹۳۸ء) اور بی ایڈ۔ (۱۹۳۹ء) کی اسناد حاصل کیں۔ اوردہ واپس آئے، تو سونپیل بورڈ میں تعلیمی سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ ملا۔ اسی دوران میں انھوں نے نجی مطالعے سے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کی سند لی (۱۹۵۷ء)۔ تین برس بعد (۱۹۶۰ء) سونپیل بورڈ سے رخصت لی اور اٹھیل ایک محمدائی اسکول بچی کے پرنسپل کی حیثیت سے وہاں چلے گئے۔ لیکن بچی کی مرطوب آب و ہوا اس نہ آئی اور بیمار رہنے لگے۔ بادل ناخواستہ ملازمت ترک کر کے وطن واپس آئے اور دوبارہ اپنی جگہ سنبھال لی۔ ۱۹۶۷ء میں جب امام المدارس ہائی اسکول ترقی کر کے انٹر کالج بن گیا، تو یہ اس کے پرنسپل مقرر ہوئے؛ اپنی وفات کے وقت اسی عہدے پر قائم تھے۔

ان پر قلب کا پہلا دورہ اپریل ۱۹۷۱ء میں پڑا تھا، جب وہ الزابا میں کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ دوسرا موت کے چار دن قبل پڑا۔ اس سے کچھ افاقہ محسوس کر رہے تھے کہ اچانک تمیرا شہید ترین حملہ جمعہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۲ء شب میں نوبچے ہوا۔ نصف گھنٹے بعد جان بحق ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن (ہفتہ ۲۱ اکتوبر) اٹھا؛ امام بارگاہ محمد ارحیٰ خان میں اپنے والد کے جوار میں سپرد خاک ہوئے۔

پڑھنے لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے سے تھا؛ اس میں خدا داد ذہانت اور ذاتی وجدان ان کے رہنما ثابت ہوئے۔ لکھنے کا آغاز ۱۹۳۲ء میں ٹیگور کی بعض تحریروں کے ترجمے سے ہوا جو مختلف مقامی محلوں میں شائع ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں آل انڈیا ریڈیو سے تعلق پیدا ہوا، تو بچوں اور خواتین کے پروگراموں کے لیے بہت کچھ لکھا۔ ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین نے ایک رسالہ "نئی روشنی" کے نام سے جاری کیا تھا، سید سنی حسن اس کے لیے لکھنے لگے۔ بعد کو جب خود اعتمادی پیدا ہوئی اور احباب کا حلقہ بھی وسیع ہوا، تو ان کے مضامین اور افسانے دوسرے رسائل و جرائد میں بھی چھپنے لگے۔ ان کے ہم الطبع زاد اور مختار مضامین اور افسانوں کا مجموعہ "نک پارے" کے عنوان سے دہلی سے ۱۹۵۲ء

ہیں شائع ہوا تھا؛ اس کے شروع میں ڈاکٹر سیّد ماجد حسین نے قلم سے چند سطریں ”تقریب“ کے عنوان سے ہیں۔ ان کی کتاب ”ہمارا قدیم سماج“ ان کی موت سے تھوڑے دن پہلے شائع ہوئی تھی۔ ترقی اردو بورڈ ہی کی فرمائش پر انہوں نے پروفیسر تریپاسنی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ”تقدیم ہندوستان کی تاریخ“ کے نام سے کیا تھا۔ جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ ان کے مضامین کی خاصی بڑی تعداد مختلف رسائل میں منتشر پڑی ہیں۔

مخفی، صالحہ سیکم

۱۹۴۴ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے خاندان کا سقراط الس پٹنہ تھا۔ جہاں سے ان کے دادا بہار اور بنگال کے اضلاع میں ملازمت کے بعد کلکتہ پہنچے اور وہیں بس گئے۔ مخفی کے والد سید وحید الدین احمد نے علی گڑھ میں تعلیم پائی اور بعد کو کلکتہ میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ خاندان کا ماحول انگریزی کی تعلیم کے باوجود مذہب اور تصوف کی روایت میں رچا ہوا تھا۔ چنانچہ سید وحید الدین احمد بھی دفتر سے آتے، تو درس و تدریس میں مشغول ہو جاتے، اور ان کے ارد گرد اصحاب علم و فضل کا مجمع رہتا۔

خان بہادر نواب محمد تقی پٹنہ کے رئیس اور بااثر اشخاص میں سے تھے، لیکن ان کی ناوقت موت نے گھری مالی حالت بہت کمزور کر دی۔ لہذا ان کی سگم نے بچے کی جاداد بیچ ڈالی اور جو کچھ ملا، اسے اور اپنی دونوں کسنتیوں کو لے کر کلکتہ چلی آئیں۔ یہیں چھوٹی کا عقد نکاح سید وحید الدین احمد سے ہوا۔ بد قسمتی سے وحید الدین احمد بھی جوانی کی کاشکار ہو گئے۔ اس وقت صالحہ سیکم بہت کم عمر تھیں۔

صالحہ سیکم کو کسی اسکول میں باضابطہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا جو کچھ حاصل کیا، گھر پر اپنی ذاتی محنت اور لیاقت سے۔ بد قسمتی سے خانگی زندگی بہت الناک رہی پہلی شادی سورت کے ایک صاحب مہاس بھائی سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک لڑکی (طابرو کلثوم) ہے۔ ان سے علاحدگی کے بعد تعلیم اور سماجی کاموں میں دلچسپی لینے لگیں۔ چھوٹی بچیوں کے لیے مدرسۃ البنات الفربا (مانتی بنگال) اور بڑی لڑکیوں کے لیے ہونڈہ میں ایک قسم خانہ قائم کیا۔ انھوں نے دونوں ادارے

بحسنِ خوبی کامیابی سے چلائے لیکن دوسری بڑھ جانے اور مالی مشکلات کے باعث بعد کو انھیں دوسروں کے حوالے کر دیا، یہ یقیناً آج تک چل رہے ہیں۔ اسی زمانے میں ان کا نکاح ثانی عبدالحی صاحب سے ہوا، جو مقامی پرنسپل ڈپٹی کالج میں انگریزی کے مدرس تھے۔ بد قسمتی سے وہ ۱۹۴۷ء میں جاندر میں ایک فرقہ وارانہ فساد کا شکار ہو گئے۔ ان سے دو بیٹیاں ارضیہ بانو اور فاطمہ فرخ آباد گاریں۔ اگرچہ بنفس کا عارضہ پرانا تھا، لیکن موت ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو اچانک انتشارِ دم سے ہوئی۔

انھوں نے شاعری ۱۹۳۲ء میں شروع کی اور اس میں کسی سے اصلاح نہیں لی۔ انھوں نے کسی زمانے میں ہفتہ وار ”ہجرت“ بھی لکھتے سے جاری کیا تھا، جو بہت دن تک ان کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں ان کے مسلمانوں کا مجموعہ ”جذباتِ محفّی“ کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ نیا شاہکار کے نام سے کچھ افسانے شائع ہو چکے ہیں (کلکتہ ۱۹۵۶ء) اس مجموعے میں افسانے حروفِ تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔ اور چھپس حرفی ان کی خصوصیت ہے۔ مثلاً پہلا افسانہ ہے: الف کا افسانہ۔ اس میں بیشتر الفاظ ایسے ہیں جو ”الف“ سے شروع ہوتے ہیں۔ دوسرے افسانے کا عنوان ہے: بے کی بوجھار۔ اس میں استعمال شدہ الفاظ ”ب“ سے شروع ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مختلف اصناف میں کلامِ نظم و شری بہت بڑی مقدار ایسی ہے، جو آج تک شائع نہیں ہوئی۔ یہ مستورات ان کے خاندانی میں موجود ہیں۔

کلکتہ کے ادبی حلقوں میں ان کی خاصی مشہرت تھی، اور خواتین میں تو بلاشبہ وہ صغیرِ اول کی ادیب شمار ہوتی تھیں۔

ان کے کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، اگرچہ دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ کلام میں کوئی خاص بات نہیں، چنانچہ ان کی زندگی بھر پریشانی میں گزری، خاص طور پر خاندانی سکون بہت حد تک مفقود رہا، اس لیے ان کے شعروں میں بھاری اور تنہائی کا احساسِ فردیت ہے۔ ایک نظم اور چند شعرا غلطہ ہوں:

مربع نواریز

آہ لذت کشن غم، لٹ گیا دل آج کے روز
کون ہے نذر سرا
ہمچہئے انساں سے زیادہ ہے پرندہ پُر سوز
مجھے کوئل کی مہدا میں، کبھی اتنا تونہ تھا
آخرش راز ہے کیا
شدت دروچکر، آج ہوئی مہد سے سوا
تار فکوں کا بندھا

آہ، ڈوبا ہوا دل بحیرہ فوشی میں مرا
یک یک بیخ اسٹا
سوچتی تھی یہ مری کس نے اجاڑی دنیا
بجید کچھ بھی نہ کھدا
صبح دم، پچھتے ہی پڑھیرا کچھ بھی پھٹا
کس کی آئی یہ ندیا
تیراگ آ کے ترازو دل محسوس میں ہوا
تن بدن کا پٹ گیا
شور، وہ بھی غم و تاثیر کا حامل اتنا
اف اماں، بابا بخدا!
تجھ کو کوئل کہ نقیب غم، ہستی کہیے
دل میں ہے حشر سپا
کیا فوش آئند ترانہ، تجھے آتا ہی نہیں؟
کچھ تو کہ بات ہے کیا؟
دکھ بھری تان بدل، نغمہ راحت بن جا
چھوڑیہ طرز نوا

رہے شاہ سے ترشتہ جاں بخش روا
تجھ سے رنگیں ہونفتا
آئے کانوں میں کسی سمت سے جب تیری صدا
اس کا مفہوم ہو گیا
واہ لذت کشن غم شاد ہے دل آج کے روز
طاہر نغمہ سرا
سازِ نقی کے لیے وقف ہے کوئل! اتر سوز
اجڑے تجھ کو خدا

مطلب میں جب ہوزم سفر مکمل
خود اظہار منزل کرتی ہے کارواں کا
اس دل کو کس کی یاد نے دیوانہ کر دیا
کس شمع بيمشال کا پروانہ کر دیا
میرے لیے حیات میں، اکتنا جہاں تنگ ہے
کوئی بھی آہٹیں نہیں، کوئی بھی ہمنوا نہیں
مری زمیت غمزوہ ہے، مرا قلب اندرا ہے
یہی ہے مرافضائے ابی ہے مرا ترانہ
کوئی مجھرا سیر و تنہا کے نقیب پر نہ روئے
بے نفس بھی اک ٹھکانا، نہ رہا جب آشیانہ
شام ہی سے کھٹ کھٹ غن آتی رہی
خواب میں جس شب وہ زلف پر شکن آتی رہی

ہر نفس پرشتو میں ہوتا ہا، اک امتحان ہر قدم پر سنز لپ دار و رسن آتی رہی
 ادا نے حق و فایں نہ کی کمی میں لے یہ جانی میں کی لذت تھی، اس کو دی میں نے
 دیا جہان کو اک درس زندگی میں نے زلم کو غم، نہ خوشی کو کہا خوشی میں نے
 قرار کیا، مجھے دنیا میں موت بھی نہ ملی نہ جانے، کیسے گزاری ہے زندگی میں نے
 محنتی خستہ حال کی تو نے جو بات پوچھ لی شاد تجھے خدا کرے مقصد دل عطا کرے

تمت اعادی مجیدی پھلواروی، سید حیات الحق محمد مجی الدین

ترتیب دوم تین تین برگزیدہ علم و فضل اور سند نشین رشد و ہدایت خاندانوں کے نام
 یوں تھے۔ چھٹی پشت اوپر داد صیال میں تاج العارفین حضرت مخدوم شاہ
 مجیب اللہ قادری (وف ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۴ء) ان کے جدِ اعلیٰ تھے۔ تمتا کے دادا
 (مولانا سفیر الحق عمادی) کے دادا نور الحق تپاں (وف ۱۲۳۳ھ) کی شادی جناب غلام
 نقشبند سجاد بن حضرت خواجہ عماد الدین رحمت اللہ علیہ بادشاہ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔
 اور ان کے دادا شاہ سفیر الحق (وف ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء) کے عقدِ نکاح میں قاضی
 محمد دہ عالم کی صاحبزادی تھیں، اور خود قاضی مخدوم عالم کے جہاڑ عقد میں حضرت
 شاہ مجیب اللہ قادری رح کی پرہوئی تھیں۔ اسی لیے وہ اپنے نام کے ساتھ عمادی
 اور مجیبی کی نسبتیں لکھا کرتے تھے۔

تمتا کے والد شاہ ظہیر الحق ضبید کشنہ ۲۴ صفر ۱۲۵۹ھ (۲۹ مارچ ۱۸۴۳ء) کو
 پھلواروی شریف (پٹنہ) میں پیدا ہوئے یہ چراغِ مجیب سے تاریخِ ولادت (۱۲۵۹)
 نکلتی ہے۔ چونکہ گھر میں موردی زمینداری تھی اس لیے کسبِ معاش کی فکر سے
 آزاد تھے، ساری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔
 ان کا ۳ محرم ۱۳۲۳ھ (۱۰ مارچ ۱۹۰۵ء) کو پھلواروی میں انتقال ہوا، محلِ میاں
 کی درگاہ میں حضرت غلام نقشبند سجاد کے مزار کے جوار میں مدفون ہیں۔ شعوبہ بھی کہتے
 تھے: فائزِ خالص تھا کلام کا مجموعہ (دیوانِ فائز) ڈاکٹر خواجہ افضل امام (شعبانوی)،
 پٹنہ یونیورسٹی) نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ (پٹنہ ۲۱۹۶۴)

شاہ نذیر الحق فائز نے دو نکاح کیے پہلی بیوی سرسہدا (مختارہ خفر سراے منسلع گیا) کی تھیں ان سے دو بیٹیاں ہوئیں۔ بڑی، شادی کے بعد لا ولد فوت ہو گئیں؛ چھوٹی کی اولاد موجود ہے۔ ان کی دوسری بیوی مبارک۔ فاطمہ پھلواڑی شریف کے شاہ نور احمد نور کی صاحبزادی تھیں۔ نور خود بھی حضرت تاج العارفین شاہ محبوب اللہ قادری رح کے پر پوتے تھے۔ اس بیگم کے بطن سے فائز کے تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھے یہی صاحبزادے ترشا عادی کے نام سے دنیا کے علم و ادب میں مشہور ہوئے۔

تمثلاً ۳ شوال ۱۳۰۵ھ (۱۴ جون ۱۸۸۸ء) کو پھلواڑی شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ فیروز بخت سے تاریخ نکلتی ہے۔

والدین نے ان کا نام حیات الحق رکھا تھا، اگرچہ وہ مشہور رہنے ناصحیالی نام محمد علی الدین سے ہوئے۔ انھوں نے خود اپنے نام کا جمع کہا تھا جس میں یہ دونوں نام خالص سمیت موجود ہیں:

غلامی از غلامان محمد علی الدین حیات الحق تمثلاً

درس نظامی کی تکمیل اپنے والد حضرت نذیر الحق سے کی انویا عربی اور فارسی میں تھی تھے؛ انگریزی نہیں جانتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اولاً مدرسہ حنیفیہ، پٹنہ میں ملازمت کی۔ یہ مدرسہ محمدی جان بیگم نواب یوسف حسین خان کا قائم کردہ تھا؛ اسی لیے بعض لوگ اسے مدرسہ محمدی جان بھی کہتے تھے۔ یہاں وہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۸ء تک عربی اور فارسی کے مدرس رہے۔ اس کے بعد وہ تقریباً ساڑھے تین سال سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کے قائم کردہ و قیام پٹنہ (بہار) میں عربی فارسی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۲۱ء میں یہاں سے الگ ہوئے، تو پھر کسی ادارے کی ملازمت نہیں کی۔ اس کے بعد پٹنہ کے بعض مسلمان وکلاء ان سے قرآن پڑھنے لگے۔ یہ لوگ کچھ مالی خدمت بھی کر دیتے تھے۔ سر فخر الدین (ف ۹۳۸) فقہی معاملات میں بھی ان سے مشورہ کرتے رہے۔ جب ان کا انتقال ہوا، تو یہ عبدالعزیز

پیرسٹراف (۱۹۴۸ء) وزیر تعلیم بہار کے مشیر خاص اور دست راست بن گئے۔ عبدالعزیز صاحب بعد کو صدر امور مذہبی بن کر حیدرآباد (دکن) گئے، تو قسماً کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ریاست نظام سے ان کا بھی سو رولے مال نہ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ یہ انہیں انعام حیدرآباد (۱۹۴۸ء) ملک باقاعدگی سے ملا۔

۱۹۴۸ء میں وہ اپنے اہل و عیال سمیت ہجرت کر کے ڈھاکہ چلے گئے۔ اپنا کتابخانہ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ وہاں حکومت پاکستان نے انہیں رہنے کو ایک وسیع مکان دے دیا تھا۔ ملی حلقوں میں بھی خاصی آڈ بھگت ہوئی۔ وہ دو تین ڈھاکہ ریڈیو سے قرآن کا درس نشر کرتے رہے۔ غرض یہاں معاش کے پہلو سے کوئی تشویش نہیں رہی، بلکہ خاصے خوش حال اور فارغ البال تھے۔ کئی سال بعد انہوں نے ڈھاکہ سے نقل مکان کر کے چانگام میں اقامت اختیار کر لی، جہاں ان کے صاحبزادے محمد انعام الدین کا بیٹے کا لاد رہا تھا۔

ان کی بعض تصانیف مدت سے ناممکن پڑی تھیں۔ انہوں نے خیال کیا کہ ان کی تشکیل اس وقت تک ممکن نہیں کہ کراچی میں قیام اختیار کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایک آنکھ میں پانی اتر آیا اور رفتہ رفتہ بینائی نے جواب دے دیا تھا؛ اس پر آپریشن کی ضرورت تھی۔ اس لیے کراچی چلے گئے اور ایک عزیز کے وہاں قیام کیا۔ اس اثنا میں ان کے بیٹے محمد انعام الدین نے بھی اپنا کام کاج کراچی منتقل کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۶۶ء کے اواخر میں تنہا عادی ان کے پاس آئے گئے۔

آٹھ پر علی حرامی ہوا اور بینائی بحال ہو گئی۔ لیکن بد قسمتی سے ۱۹۷۲ء کے شروع میں حلق کے کینسر کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ علاج معالجہ میسور، تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کھانا دینا بالکل ترک ہو گیا۔ کیونکہ کوئی چیز حلق سے نیچے اترتی ہی نہیں تھی۔ سستال چیزوں میں سے دو چار گھونٹہ نہ خنی، یا آدمی بیالی چائے، ان کی دن بھر کی خوراک رہ گئی تھی، یہ عمر اور اتنی مختصر خوراک؛ اسی میں ۲۷ نومبر ۱۹۷۳ء (۲۰ ختال ۱۴۹۲ھ) راہی ملک بقا ہو گئے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں تین نکاح کئے پہلی شادی اپنے ہی خاندان میں علی محمد الدین پھلوار دی کی صاحبزادی سے ہوئی، یہ ان کی سگی خالہ کی بیٹی تھیں۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا (محمد امام الدین فاضل) اور ایک بیٹی (ولیمہ) پیدا ہوئے۔ محمد امام الدین نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق عربی توڑ بھائی تھی، اس کے علاوہ کچھ انگریزی بھی پڑھی۔ لیکن ان کے راسخ میں کچھ خلل پیدا ہو گیا۔ وہ یکایک کہیں غائب ہو گئے اور باوجود تلاش بسیار پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔

دوسرا نکاح برانواں (ضلع گجرات) کے حافظ شاہ بلاقی کی صاحبزادی عزیز الغافلہ کے ساتھ ہوا۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا محمد انعام الدین اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ مجاہد یہ سب موجود ہیں۔ محمد انعام الدین چانگام میں انجینئر تھے۔ لیکن معلوم نہیں کیا جی میں آئی کہ ملازمت سے استعفی ہو کر ٹھیکے داری کرنے لگے، بکراچی میں مقیم ہیں۔

ہندستان سے جانے کے بعد انہوں نے ایک نکاح آمیرا مشرقی بنگال میں بھی کیا تھا۔ ان سگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہ بھی ان کے ساتھ کراچی پہلی گئی تھیں اور ان کا تہا سے چند ماہ قبل وہیں ۱۹۷۲ء میں انتقال ہوا۔

علم و فضل اور شہسود گوی تہا کو گویا ور لے میں ملی تھی۔ وہ اردو، فارسی اور عربی، عینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ زبان و بیان اور عروض میں مہارت تا تر تھی، جو انہوں نے اپنے والد کے سیکھے تھے۔ اسلامی علوم، تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف، ہر ایک میں اجتہادی نقطہ نظر تھا اور ان کی بیشتر تصانیف انہی علوم سے متعلق ہیں۔ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ مدقوں و طائف و اوراد کے پابند رہے، بلکہ انصافی سلسلے میں خود حضرت مخدوم منہاج الدین جیلانیؒ کے سجادہ نشین بن سکے تھے، لیکن قرآن کے خاٹر سلائے کے بعد انہوں نے ان سب چیزوں سے کنارہ کر لیا، اور انہیں بدعت سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح انساب اور رجال اور تاریخ اسلام میں بھی ان کا مطالعہ اور واقفیت

غیر معمولی اور حیرتناک تھی۔

اردو کلام پر عبدالاحد شمسار لکھنوی (ف ۱۹۱۷ء) سے اصلاح لی۔ فارسی اور عربی میں مولانا شبلی نعمانی (ف نومبر ۱۹۱۴ء) سے مشورہ کیا۔ شبلی کے لفظ کا قصہ بروایت مولانا سید محمد جعفر چلواری بہت دلچسپ ہے۔

ترتار کے والد فارسی کے فاضل اور شاعر تھے۔ اسی سے انہیں بھی فارسی میں شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ بہت محنت سے کچھ غزلیں کہیں اور اصلاح کے لیے شبلی کی خدمت روانہ کیں۔ شبلی نے اس خط کے ساتھ انہیں واپس کر دیا:

میں زبان میں آپ نے اشعار نظم کیے ہیں، وہ فارسی نہیں ہے، بلکہ اردو کا فارسی میں لفظی ترجمہ ہے، اسے کی جگہ از میں کی جگہ 'رد' اور آیا کی جگہ آمد لکھ دیجئے اسے فارسی نہیں ہو جاتی۔ اگر آپ فارسی میں شعر کہنا ہی چاہتے ہیں، تو کم از کم تیس برس تک اساتذہ کا کلام بخور دیجیئے اور پھر فہم لیں کہ کون سیجیے، شاید قابل اصلاح ہو۔ لیکن شروع میں سعدی اور حافظ کا کلام قطعی نہ پڑھیے، بلکہ اپنے مطالعہ کو نظیری اور حزیں تک محدود رکھیے۔

اس خط سے مایوس تو ہوئے، لیکن جو مسئلہ نہیں جوڑے اور فارسی کے مطالعے پر جٹ گئے۔ نظیری کی رنگینی پر کشش تھی، اس لیے اسے خوب پڑھا، حزیں خشک اور ثقیل تھا، اس لیے اس سے اجتناب کیا۔ چھ ماہ بعد پھر غزل سیکھی، اور لکھا کہ میرا مطالعہ نظیری تک محدود رہا ہے، حزیں سے کوئی مرچھپی پیدا نہیں کر سکا جواب میں شبلی نے صرف ایک سطر لکھی:

حزیں کے کلام کی طرف طبیعت کا رافق نہ ہوتا، اس بات کی دلیل ہے کہ ابھی آپ کو فارسی نہیں آئی۔

یہیں دُمن کے پکتے تھے، نظیری کو چھوڑ کر حزیں کے لیے وقف ہو گئے۔ بتدریج وہ اسے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔ مزید یہ کہ روزانہ مختلف

عروں میں کچھ شعر کہتے خود ہی اس پر خود کرتے اور مضامین کر دیتے۔ سال بھر بعد پھر غزل شبلی کی خدمت میں بھیجی۔ جواب آیا: آپ کی ترغیٰ کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ برسوں کا ریا من آپ نے میزوں میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ اُس وقت آپ کی غزل قابلِ توجہ نہ تھی اور اب محتاج اصلاح نہیں۔

غرض یہ سلسلہ دہرے تک جاری رہا۔ انہیں خود اعتراف تھا کہ میری عربی اور فارسی کی نظم و نثر جو کچھ بھی ہے، یہ تمام و کمال مولانا شبلی کی مرہونِ منت ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست طویل ہے؛ ان میں زیادہ تعداد انہی موضوعات کی ہے۔ جتنا ان کی زندگی میں چھپ سکا، کم از کم اس کے برابر مسودات کی شکل میں غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ان کا بیشتر حصہ مولانا سید محمد جعفر پھولاردی (لاہور) کی تحویل میں ہے۔

اردو علم و ادب کے شائقین کی دلچسپی کی کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں: ثنوی مذہب و عقل، ثنوی معاش و معاد، ایضاً سخن (اشوق مسند طبری کی کتاب اصلاح سخن کی دس شعر کی پہلی غزل پر اساتذہ وقت کی اصلاحوں کا جائزہ)، رسالہ تذکیر و تانیث، انعامِ مرکبہ۔ ان کا نام ایک اور سلسلہ میں بھی یادگار رہیگا۔

۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ انہوں نے خافتا و عواد یہ ہنگل تالاب، پٹنہ کے کتابخانے کے برائے سؤدات میں سے دینی موضوع پر ایک مختصر رسالہ ڈھونڈ نکالا جو اردو نثر میں ہے۔ تبتاً کا دھونی تھا کہ یہ حضرت حماد الدین قلندر پھولاردی کی تصنیف ہے۔ اس کا نام ”سید عارستہ“ (اصراطِ ستقیم) تھا اور اس پر تاریخ ۲۲ رجب الاول ۱۳۵۱ء کی ثبت تھی۔ اگر یہ دعویٰ درست تسلیم کر لیا جائے، تو نہ صرف اس سے پرانی کوئی نثری تحریر اب تک بہار میں دستیاب نہیں ہوئی، بلکہ یہ پورے شمالی ہند کا سب سے پرانی نثر ہے۔ کہل کتا سے بھی قدیمتر، جس کی پہلی روایت ۱۱۴۵ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ لیکن بعض حلقوں کی طرف سے اس کی صحت پر شبہہ وارد کیا

گیا ہے۔

کتاب کے مختلف حصوں میں ان کے شاگردوں کی کافی تعداد ہے۔ ہر فیصلہ بخدا العزیز احمد (صدر شعبہ عربی، اعلیٰ گزٹہ مسلم یونیورسٹی) نے کسی زمانے میں شاعری کی ہے: وہ آرزو تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے بھی تمنا سے اصلاح لی ہے۔

انہوں نے، کہ ان کے اردو یا فارسی کلام کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا، حال اہل کہ ضمیمہ کلیات کے برابر ذخیرہ ہو گا۔ چند غزلیں بڑی مشکل سے دستیاب ہوئیں: انہیں کا انتخاب درج ذیل ہے۔ زبان پر قدرت، محاورے اور روزمرے میں استادانہ نگاہ، عروض کی ماہرانہ واقفیت ایک ایک مصرعے سے عیاں ہے:

تم تمنا سے کیوں نہیں مٹتے	آدھی ہے بڑی مردت کا
گلشن میں وہ پانوں جھبا! پچ کے بکنا	مرد میں تمنا کی ابھی آنکھ لگی ہے
جو گیا شباب، انہوی، تو گئیں وہ ساری باتیں	زندہ شہرتوں کے دل پر زندہ رستوں کی باتیں
تجھے میں بھلا دوں لیکن کبھی بھول سکتی بھی ہیں	قبر کی بھولی بھالی صورت تیری بیٹھی بیٹھی باتیں
کوئی توڑنے کی شے ہے شب و دل کا فتور	وہ مزے مزے کی چلیں وہ مزے مزے کی باتیں
زنگیں سی آنکھ سرو ساندہ بربگ کی سے لب	گلشن میں آج کون سا پاپا ہن گیا

رخ و زلف و ابرو و چشم و لب۔۔ کہو کس کی کس کی ہے کوئی
میں اور تو دشمن جاں سبھی، اگر ایک ہو، تو کہے کوئی
وہ نے کسی کو بھی آج تک کہہ دیا ہے حضرت دل! قصہ
فقط آرزوی میں رات دن جو رہے کوئی، تو رہے کوئی
میری سرگزشت ہے گفتنی، مرا ما بسرا ہے شنیدنی
نہیں سنتے وہ، تو کہوں میں کیا، جو سنے کوئی، تو کہے کوئی
یہ ہزار طرح کی گالیاں، وہ بھی دشمنوں کی زبان سے
کہے تو بھی چاہے، بُرا بھلا، مگر اپنے منہ سے کہے کوئی

مرا قتل جسرم و فاپہ ہے، میں ہوں اپنے جرم کا مستحق
جو سزا ہو، میری ہی ہو سزا، مگر ان کو کچھ نہ کہے کوئی
نہیں چشم و گوش پہ کام کے رہے عقل و مدہش تو نام کے
جو ہے مصیبت زندگی تو اب اس قدر نہ ہے کوئی
لگے کہنے آج یہ دیکھ کر کہ تمنا ان کی لگی سیں ہے
یہ زرا پسند نہیں مجھے کہ مری لگی سیں رہے کوئی

وہ فقہ جو نقاب تو رخ سے جدا کرے	دنیا اگر ادھر کی اڑھری ہو کرے
یہ بزم غیر سہی، اک زرا نظر تو لے	کہ آنکھوں آنکھوں میں تھوڑی سی گنگو ہو جائے
میں! میں نہ ملیں، ہے یہاں تلاش کی جن	خدا کردہ کہیں ختم جستجو ہو جائے
ساتی لاگتا ہے، مہن مہن ہے بہار ہے	اب کار خیر میں تجھے کیا انتظار ہے
نکلیں جس نے ہاتھ سے کھوئی وہ خدر ہے	خود زندگی جو خاک میں آئی، فبا رہے
سب بند اور وقت ہے عرضِ نیاز کا	ہنگامہ زیرِ رب ہے سخنہائے راز کا
نغموں سے شوقِ دید کے تابِ نظر ہیں مست	ہر پردہ اپنی آنکھ کا پردہ ہے ساز کا
اک یقیں بالآخر اپنا ہر گناہ بنت گیا	خواب ہم دیکھا کیے، روزِ اک جہاں بنتا گیا
ہم گرے کتنی جگہ راہِ طلب میں سر کے بل	ہر جگہ گویا تمہارا آستانِ بنتا گیا
رنگ اڑا، آنکھیں چڑھیں، بگیں گریں، ہچکی زندگی	چپ لگی، تو لاکھ عنوانِ بیاں بنتا گیا
راہِ آزادی تو خود ہوتی ہے رہرو آفریں	گرد و رہاڑی گئی، مادرِ کارِ داں بنتا گیا

مجھ کو تمنا! یاد ہے بحدہ پہ بحدہ نے یہ چنے
ہاے، تم اور یہ شغل سے! کئی سنے تو کیا کہے؟

سید احتشام حسین رضوی، پروفیسر

محمد اور فیض آباد کے درمیان (انٹرمیڈیٹ کے قریب) ایک مختصر قصبہ سماٹا نو "ماہل" نامی ہے۔ یہاں سادات رضوی کی آبادی بہت پرانی ہے۔ انہیں میں ایک صاحب سید ابو جعفر رضوی ہوئے ہیں۔ وہ بڑے باہمت اور زمین فروش تھے۔ اگرچہ گھر کی کچھ اوسط درجے کی زمینداری تھی، لیکن اب اس سے آمدنی اتنی نہیں رہی تھی کہ گھر کے اُمیلا خرچ کی کفیل ہو سکے۔ لہذا انہوں نے اس میں اضافہ کرنے کو ملازمت کا پیشہ اختیار کر لیا، اور واقعاً بیشتر ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ جب ۱۶ جنوری ۱۹۲۹ کو ان کا انتقال ہوا ہے۔ تو سن ۱۹۲۵-۲۶ برس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ ان کی وفات بہت افسوسناک حالات میں ہوئی۔

دسمبر ۱۹۲۸ میں سید ابو جعفر کسی کام سے نکلتے گئے، تو سر کرانے کے لیے اپنے بڑے بیٹے احتشام حسین کو کہیں ساتھ لیتے گئے۔ سیر سپاٹا ختم کرنے کے بعد واپسی ہوئی، تو ریل کے جس ڈبے میں یہ دونوں سوار تھے، اسی میں چیچک کے مرض میں مبتلا ایک اور مسافر ان کا ہمسفر تھا۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس پر مرض کا زبردست حملہ ہو چکا تھا، اور وہ متواتر قے کر رہا تھا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، لیکن اس سے سفر کی بھی کوئی صورت نہیں تھی۔ آخر وہی ہوا، جس کا اندیشہ تھا۔ گھر پہنچتے ہی دونوں باپ بیٹے چیچک کی گرفت میں آ گئے۔ مرض اتنا شدید تھا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ سید ابو جعفر تو بالآخر اسی میں چل بسے، لیکن احتشام حسین کچھ دن کی درد و کشش کے صدقے پنج نکلے۔ جن لوگوں نے انہیں بعد کے زمانے میں

دیکھا ہے، انھیں معلوم ہو گا کہ ان کا منہ چھپک کے دونوں سے بھرا ہوا تھا! یہ اسی حار لے کی یادگار تھی۔

ابو جعفر نے اپنے چھپے اولاد میں چار بیٹے (احتشام حسین، وجاہت حسین، انصار حسین) اقتدار حسین) اور ایک بیٹی چھوڑی۔ ان میں سید احتشام حسین سب سے بڑے تھے؛ ان کا والدہ کا نام زاہدہ النساء بیگم تھا؛ بغضِ تہائی یہ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔

اگرچہ سرکاری کاغذات میں سید احتشام حسین کی تاریخ ولادت ۱۲ جولائی ۱۹۱۲ء درج ہے، لیکن وہ درحقیقت ۳۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو ماہل سے آٹھ میل دور اٹریڈیہ گاؤں میں پیدا ہوئے، جیسا کہ انھوں نے ایک مرتبہ میرے دریافت کر سٹے پر بتایا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں ماہل میں پیگ کا دور دورہ تھا، اس لیے خاندان کا ان کے چھوٹا سید محمد قاسم حسین کے وہاں قیام تھا۔ اہل خانہ تعلیم، بچے کے مل اسکول میں پائی۔ اس کے بعد اعظم گڑھ پہنچے اور یہاں کی قدیم آسٹریلیائی مشنری درسگاہ، دیرنی بانی اسکول سے ۱۹۳۰ء میں دسویں درجے کی سند درجہ اول میں اس امتیاز سے حاصل کی کہ ان کا نام اسکول کی سنزائی فہرست کے تختے پر لکھا گیا۔ یہ نام آج بھی وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس دوران میں والد کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر کے حالات اب مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے سازگار نہیں رہے تھے چچا محیم سید ابو محمد عیش نے بساطِ بھروسہ کی، لیکن وہ بھی پورا بار اٹھانے سے معذور تھے۔ بھلا عزمِ حکم اور یقینِ کامل کے رستے میں کوئی شے کہیں حاصل ہو سکتی ہے! اگرچہ یہ زمانہ مسلسل کشمکش اور جدوجہد کا تھا، لیکن نوجوان احتشام حسین ہمتِ نہیں ہارے۔ خوش قسمتی سے ان کے چھوٹا سید محمد قاسم حسین بسلسلہ ملازمت الہ آباد میں مقیم تھے؛ وہ کوئٹہ شہر کے پیشکار رہتے۔ انھوں نے اپنے پاس بلایا اور قای گورنمنٹ انٹر کالج میں داخل کرا دیا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کا تبا دلہ باہر ہو گیا، تو احتشام صاحب سید نعت حسین (والدہ محطفی زیدی) کے مکان پر آٹھ مئی ۱۹۳۱ء سال بھیران کے

ساتھ قیام رہا۔ ۱۹۳۲ء میں انٹر کے بعد ہی اسے میں داخلہ لیا تھا کہ کس طرح ڈاکٹر سید عجاز حسین مدظلہ اوردوالہ آباد یونیورسٹی ان فروری ۱۹۷۵ء تک ان کی خدمت پہنچی۔ انہوں نے ان کے سب سے گواہنے مکان میں ایک گمرو دے دیا۔ ۱۹۳۲ء میں بی اے کا امتحان درجہ اول میں امتیاز سے پاس کرنے پر ایم اے میں تمغا اور وظیفہ لا بچہ ۱۹۳۹ء میں بیس سے ایم اے (اردو) کا امتحان اس امتیاز سے پاس کیا کہ پوری یونیورسٹی میں اول آئے، درجہ اول حاصل کیا اور آرٹ فیکلٹی کے بہترین طالب علم قرار پانے پر سونے کا تمغا ملا۔

اس کے بعد ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ کے شعبہ اردو میں مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں پدمشاہہ ملنے لگا۔ اور بارہ سے اقدار سے حافیت کی سائنس لیٹ نصیب ہوئی۔

لکھنؤ سے ۴۵ میل دور گڑم نام کا ایک اچھا مشہور قصبہ ہے۔ یہاں ایک ریلوے سٹیشن ہوئے ہیں۔ وہ اپنے پیشے میں بیت کا مایا سب سے اور انہوں نے قریبی ماوار ہند کی سختی، سختی کہ وہ ساڑھے چھ ہزار سالہ کے مانگزار بن گئے، ان کے کئی اولاد میں تھیں۔ ان میں منجھلے بیٹے کا نام میر حسن مسکری تھا، جن کے دو بیٹیاں ہوئیں، بڑی کا نام کاظمی بانو تھا اور چھوٹی کا کاظمی بانو۔ ان دونوں کی ایک ہی دن ۳ جنوری ۱۹۳۸ء کو شادی ہوئی، بڑی شمیم کرپانی (۵ مارچ ۱۹۰۵ء) کے عقد نکاح میں آئیں، اور چھوٹی سید احتشام حسین کے۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس نشی، پریم چند، ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی زیر صدارت لکھنؤ میں ہوئی۔ سید احتشام حسین اس تحریک کے آغاز ہی میں اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لکھنؤ کے قیام کے زمانے میں ان کا مکان (مکھڑیا روخانہ، گولہ غنچ) ترقی پسندوں کی سرگرمیوں کا مقصود تھا، اور دوسرے ادیبوں کا علمو نامہ مرکز بنا رہا۔ یہاں ہر اتوار کی شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا جلسہ ہوتا، نظم و نثر کی تحلیقات پیش ہوتیں اور ان پر بحث و تمحیص ہوتی۔ یہ جلسے

تقسیم ملک تک جاری رہے۔ ان سے جہاں رفتہ رفتہ فوجواں نکھنے والوں کا مستعد کردہ تیار ہو گیا، وہیں خود سید احتشام حسین کو بھی اس سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔ ان کا ذاتی مطالعہ بہت گونا گوں تھا۔ وہ بہت تیز بڑھنے والے تھے، ضخیم سے ضخیم کتاب دو چار دن میں دیکھ جاتے۔ حافظہ بہت اچھا پایا تھا، جو بڑھتے، اس کا بیشتر حصہ دماغ میں محفوظ رہ جاتا۔ انھیں اردو انگریزی کے علاوہ ہندی میں بھی پوری مہارت حاصل تھی۔ تاریخ اور فلسفہ اور ادب ان کے خاص موضوع تھے۔ اردو کا پورا سرمایہ تو انھیں دیکھنا ہی تھا کہ اس کا پڑھنا ان کے فرض منصبی میں داخل تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے انگریزی کے واسطے سے عالمی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا، اور وہ منسہری ادب کی تحریکوں سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ ان ہفتہ واری ادبی جلسوں میں ان کی تنقیدی صلاحیتیں بیدار ہوئیں، انھیں مختلف موضوعات پر فی البدیہہ تقریر کرنے اور بحث مباحثے میں حصہ لینے کی شوق ہوئی، اور یوں انھیں اپنے مطالعے کے نتائج کو نظریات اور اصولوں میں ڈھالنے کا موقع بھی ملا۔ بتدریج وہ ہماری زبان کے سربراہان اور نقاد اور ادب تسلیم کر لیے گئے، فرض ان کا یہ کھنڈ کا قیام ان کی شخصیت اور کردار کی تشکیل اور ارتقاء کے لحاظ سے بچہ اہم زمانہ ہے۔

سید احتشام حسین اگرچہ کبھی کمیونسٹ پارٹی کے باقاعدہ رکن نہیں رہے، لیکن اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ وہ کسی نقطہ نظر کے ہمدرد تھے۔ ان کی تحریروں میں جہاں تہاں اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ ادب اور زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے خلاف تھے۔ اسی لیے وہ روایت اور ماضی سے رشتہ منقطع کرنے کو بھی غلط سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ادب اور سماج کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے اور ان پر الگ الگ بحث کرنا نہ صرف مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ بے اوقات یہ غلط نتائج تک پہنچا دیتا ہے۔

ادب اردو کے میدان میں ان کی حیثیت مسلمہ تھی۔ سب معلقوں میں ان کی رائے

وقت کی نظر سے دیکھی جاتی تھی۔ فردی ۱۹۵۲ء میں امریکا کے مشہور ادارے راک فیلڈ فاؤنڈیشن نے انھیں پیشکش کی کہ وہ اس کے خرچ پر امریکا اور انگلستان ہو آئیں۔ بنگاہر کوئی خاص منصوبہ تو نظر نہیں تھا ابس جائیں اور ان ملکوں کے مصنفوں، پروفیسروں، دانشوروں، دانشوروں، سربراہان اور وہ لوگوں سے ملیں ان سے گفتگو کرنے کے بعد دیکھیں اور مشورہ دیں کہ ہندوستان کی ادبی زندگی کی تنظیم اور یہاں کے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کی تصنیفات کی اشاعت کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔ اشتام حسین کی آرا اور مصلحتات کسی سے مخفی نہیں تھے۔ اس لیے وہ تعجب تھے کہ امریکا سے یہ دعوت آنے کی لم کیا ہے؟ اسی لیے وہ اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن سب اعزہ واجباب نے اصرار کیا کہ ایسے موقع روز بروز نہیں ملتے، دعوت قبول کرلو۔ بالآخر بہت حمیں بیٹھیں کے بعد انھوں نے یہ پیشکش منظور کر لی۔ وہ ستمبر ۱۹۵۲ء میں یہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں پھرے پروفیسروں سے ملے جلے، ان کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سربراہان اور وہ لوگوں سے بھی ملاقاتیں رہیں۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں وہ امریکا سے انگلستان چلے آئے۔ وہی پروگرام یہاں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج میں بھی رہا۔ اسی دوران میں چند دن کے لیے پیرس کا ایک چمک چمک بھی کاٹ آئے۔ بالآخر نو دس مہینے کی غیر حاضری کے بعد جولائی ۱۹۵۳ء میں واپس وطن پہنچے۔ ان کی کتاب ”ساحل اور سمندر“ اسی سفر کی ڈائری ہے۔

معلوم نہیں، راک فیلڈ فاؤنڈیشن نے جس مقصد سے انھیں امریکا جانے کی دعوت دی تھی، وہ پورا ہوا یا نہیں۔ لیکن اس سفر سے پروفیسر اشتام حسین کو یقیناً بہت فائدہ پہنچا۔ سیاحت اور مختلف ملکوں کا سفر ہر حال میں تعلیم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لیے سیدنا خواجہ فیاض الرحمن کا ارشاد خداوندی ہے۔ امریکا اور انگلستان میں انھیں وہاں کے اساتذہ ادب اور اساطین فکر و فکر سے ملنے اور ان سے تبادلاً خیالات کرنے کا

موقع ۵۔ سونا کھوٹی پر چڑھ کر سندن بن گیا۔

۶۱۹۶۰ میں ان کے ارستاء: ڈاکٹر امجد حسین شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی مدد سے سبکدوش ہوئے، قرآن کی جگہ انہیں ملی، اور وہ الہ آباد منتقل ہو گئے۔ اب ان کی مشہرت کا آئنا نصف النہار پر تھا۔ ملک کی کوئی اردو تحریک ان کے مشورے سے محروم نہیں تھی، وہ ہر جگہ قولاً اور فعلاً اس میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے تھے۔ ان یونیورسٹیوں میں جہاں اردو کا شعبہ تھا، ڈیشریز و نعب میں ان کی رائے کا دخل تھا۔

۶۱۹۶۹ میں غالب کی سدا سالہ برسی بڑے خوش و خوش سے منائی گئی تھی ہندستان میں اس سلسلے میں جو کچھ ہوا، وہ سب کے علم میں ہے۔ بیرونی ممالک میں سے روس نے اس بارے میں خاص اہتمام کیا اور ہندستان سے بھی کچھ لوگوں کو ان تقریبات میں شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ پانچ اصحاب کا ایک وفد روس گیا تھا۔ اس وفد کے لیڈر ڈاکٹر عبد العظیم دانش پال سرکاری گورنمنٹ یونیورسٹی (ف فردی ۶۱۹۷۶) تھے اور راکین میرا بر و فیئر سید احتشام حسین اپنی اعلیٰ، مجروح سلطان پوری اور پو خاکسار تھے۔ ہم لوگ ۴۴ مئی ۱۹۶۹ کو یہاں سے روانہ ہوئے اور ۳۱ مئی ۶۱۹۷۹ کو واپس آئے۔ ہم اوزبکستان اور تاجکستان کے متعدد شہروں کے علاوہ ماسکو اور مینسکر گز بھی گئے تھے۔ ان دو ہفتوں میں مجھے سید احتشام حسین کو بیت، قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنی ذہانت، حاضر جوابی، علم کی وسعت، اور خیالات کی پختگی کا ثبوت دیا۔ وہ ساتھ کے ساتھ اس سفر کا روزنامہ بھی لکھتے رہے تھے۔ نہ جانے یہ آج تک شائع کیوں نہیں ہوا!

انہوں نے ۶۱۹۷۳ میں ۶۰ برس پورے کر چکے تھے اور قاعدے کے مطابق منقریب ملازمت سے سبکدوش ہونے والے تھے۔ انہوں نے طے کیا تھا کہ اس کے بعد انہوں میں مستقل سکونت اختیار کرینگے۔ چنانچہ وہاں اپنے پرانے مسکن بارودخانہ کے نواحی احاطہ ممتاز حسین میں ایک مکان بھی خرید لیا تھا۔ لیکن تدبیر کند بندہ و تقدیر

کند خندہ۔ ان کی صورت بالعموم بیت اُچی رہی تھی؛ بعد سے کئی کبھی شکایت کرتے تھے۔ لیکن مجددِ حکیم کو ستمبر ۱۹۷۳ء صبح ساڑھے آٹھ بجے ایک نوبتِ دل کے در و کلا شدید دورِ پڑا، اور اس سے پیشتر کہ طبی اسدائے پنج اسکے آؤنا قانا روح نفسِ منفرد سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ سَاجِدُونَ۔ جنانہ اگلے دن سپینگر کو اٹھا کر بلا، الہ آباد میں آخری خواجگاہِ نصیب پورنی۔ منانہ جنازہ سنی اور شیعہ حضرات نے الگ الگ پڑھی۔ ملک بھری میں وسیع پیمانے پر ان کا ماتم ہوا، وہ ان کی ہر و لعزیزی اور مقبولیت پر دال ہے۔

شعبد اصحاب نے تاریخ و قات لکھی۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندھوی (لکھنؤ) نے حالی کے مرثیہ غالب کے ایک مصرعے: ”رہلتِ خیر روزگار ہے آج“ سے تاریخِ حالی اس سے ۱۹۷۲ء برآمد ہوتے ہیں ہر ونیسر سید سن سرمد (شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی) نے بھری میں قطعہ کہا: اس کی آخری بیت تاریخ ہے: یہ ان کی موت کی سرمد نے ہے لکھی تاریخ: ”بہاؤں کا فاجدہ ہے مرگب انشام حسین“

(۱۳۹۲ھ)

جسائی یادگار میں چند پتے چھوٹے، چار بیٹے، جعفر عباس (محمد بیاں) ہا، جعفر مسکری (حسن میاں)، ارشد حسین (ارشدمیاں)، جعفر اقبال (اقبال میاں)، اور دیپتیاں (سعیدہ اور شریا)۔

ان کی سب سے پہلی مطبوعہ کتاب افسانوں کا مجموعہ ہے جو ”ویرانے“ کے نام سے شائع ہوا تھا (الذآبا ۱۳۴۳ھ) یہ دوسری مرتبہ ۱۹۷۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ تنقیدی جائزے (حمدرآبا ۱۳۴۴ھ) یہ بعد کو الذآبا سے ۱۹۷۵ء میں اور لکھنؤ سے ۱۹۵۱ء میں اور اس کے بعد کئی چھپی: روایت اور بغاوت (حمیدرآبا ۱۹۷۷ء) نیز ۱۹۵۶ء، ادب اور سماج (لکھنؤ ۱۹۷۸ء) تنقید اور ملی تنقید (دلی ۱۹۵۲ء) ذوقِ ادب اور شعور (لکھنؤ ۱۹۵۵ء) سائل اور مستند (لکھنؤ ۱۹۵۳ء)۔

اردو سائنس کا اتھاس (ہندی میں) (علی گڑھ ۱۹۵۵ء) اسی کا دوسرا ایڈیشن اردو سائنس کا آکھنجا تک اتھاس کے عنوان سے ۱۹۷۰ء میں الز آباد سے شائع ہوا، اس کا ترجمہ روسی زبان میں بھی ہوا ہے جس اور گئے (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۲ء) انکار وسائل (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۳ء) تنقیدی نظریات (لکھنؤ ۱۹۵۹ء، ۱۹۷۰ء) اعتبار نظر (لکھنؤ ۱۹۷۰ء، ۱۹۷۵ء) کلکی ازاد راجا کرشنن کا ترجمہ (دہلی ۱۹۷۱ء) دو کائنات از رو میں رولان کا ترجمہ (دہلی ۱۹۷۳ء) گنگی کی کہانی از موراسکی (دہلی ۱۹۷۷ء) انتخاب آب حیات (دہلی ۱۹۷۲ء)

غیر مطبوعہ کتب ابول میں خوش اور اس کا فن اور سفر نامہ روس زیادہ اہم ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ تاریخ ادب اردو مرتب کر رہے تھے۔ افسوس کہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ بہر حال جتنا حصہ بھی لکھا گیا، اسے محفوظ کر دینا چاہیے۔

مرحوم شعر بھی کہتے تھے اور کبھی کبھی احباب کے اصرار پر مشاعرے میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا۔ وفات کے بعد یہ مختصر سرمایہ ”روشنی کے درپے“ کے عنوان سے چھپا (الز آباد ۱۹۷۳ء)۔

آخری زمانے میں انھوں نے ایک قلمی نام، ”ا۔ ح نور ازل“ اختیار کر لیا تھا اور اس کے تحت نقلیں لکھا کرتے تھے۔ معلوم نہیں ہوسکا کہ کیا بات یہ نام اختیار کرنے کی محرک ہوئی۔ وہ نقلیں اس سے پہلے بھی لکھتے رہے تھے، اور یہ قلمی نقاب اوڑھنے کے بعد جو منظومات انھوں نے پیش کیں، ان میں پہلے کلام سے کوئی ماہر لاشباز خاص بات بھی نہیں ہے۔ ان کا عنوان انھوں نے ”آوازیں“ رکھا تھا؛ یہ بھی اس عجیبوے (روشنی کے درپے) میں شامل ہیں۔

اب نونے کے چند شعر دیجیے :

مک سجد آسودہ ساحل ہیں، اے ہنشین !

اُڑا جب وقت طوفانوں سے ہم لکرا گئے

بستیاں ہوتی تھیں برباد، دیرانے بڑے
ہم یونہی منزل بہ منزل چاندھڑا گئے
اک ادھورا خواب بن کر رہ گئی ہے زندگی
اے خیال دوست! اب تجھ سے بھی ہم گھبرا گئے

تو تو خاموش ہی رہا، لیکن سن لیا شوق نے جواب ترا
گرچہ آغاز محبت نے دیے ہیں دھوکے لیے جاتی ہے کہیں کاوش انجام بھے
کچھ ایسی ہی گزشتی ہے کہ غم ہو گیا دل بھی
آنکھوں کو لہو رونے کا ارمان تو نہیں ہے
روشن نہ یہی صبحِ وطن، اے دل پُر شوق
بیردلتی شاہِ غریباں تو نہیں ہے

کیا دلہیز مسیح تھی کیا دلہنِ شام! جاتے ہی ان کے رولتی شام دھو گئی

تکادو دوست ہا نمازِ اتفاقات لی اب اور چاہیے کیا، دولتِ تجلی

مری دفن کو تغافل کا ہو گیا دھوکا اس احتیاط سے وحشیہ اتفاقات لی

کہیں کہیں تو شری یا دیں ملا وہ سکوں کہ دردِ بھرپہ ہم اعتبار کرنے سکے

جیسے کہیں سے دولتِ کونین مل گئی کیسا حسین وعدہ بے اعتبار ہے

اک گردشِ دوام ہے دردوں کی زندگی کیسا کھلا فریب خیالی قسار ہے

عادت سہی ہو گئی ہے، دگر نہ ترا قسار تھا اعتبار پہلے، نہ اب اعتبار ہے

کیوں کر کہوں کہ قرب ترا بے اثر رہا لیکن خیمِ فراق کی لذت ہی اور ہے

ظاہر نہ کر سکا میں اسے اشکِ واہ سے لے دوست میرے غم کی حقیقت یہی ہے

جب سے غم کا ہوا ہوں رمزِ خناس یا س کرتی ہے بے قرار، نہ آس

کل تو خیر، ان کی یاد آئی تھی آج کیوں سے افشا اداس اداس!

حسنِ نمازاں ہے جس تغافل پر عشق کو بھی وہ بات آتی ہے

کوئی تو بات تھی اہل جنوں کے جہور میں انہی میں سب کی نگاہیں جہاں سے گزرتے ہیں

یقین کی منزل پر غارتگ پہنچے میں ہزار محض درم و گمان سے گزرے ہیں
تدکیم! ہو محمد اس وقت کیف مرشدی دیار کا کل منبر نشاں سے گزرے ہیں
اے دوست ہیکدے میں یہ کیسی ہوا چلی سب قندھانے دیر درم یا دا گئے
ایک ایک کر کے ٹوٹ چکے ہیں خرد کے بُت تجھ سے جنوں کے مستم یا دا آ گئے

بچا کے سب کی نظر جس سے دیکھتے ہو بھے
ہزار طرح کی لذت اس اک نگاہ میں ہے

اشفاق بڑھے، تو بڑھے، میں نے ندیم! ہوساری رات دلف شبنم شبنم کی بات
کاشن نور میں فطرت بھی کام آتی ہے خزاں کی خود میں غلج بہار پختے ہیں
تری نگاہ بیگانی ہے شوق کا حبارد جو اس چراغ بجھے، سو چراغ جلتے ہیں
ناموس، دغا کی پاس بہانی سے جاؤں کہاں یہ چشم پرما

دھم ہی چشم توتا سے دغا کی اٹھ جائے اس طرح تو نہ کوئی اہل محبت کو ستائے
اپنی زلفت کی صلیب آپ بے پھر تاپوں یہ بڑا بوجھ، محبت کے سوا کون اٹھائے!
تجھے پسند جو دل کی لگی نہیں آتی بھئی راس تری اجن نہیں آتی

کچھ مرے حقوق نے درپردہ کہا ہو جیسے آج تم اور یہ تصویر جیسا ہو جیسے
یوں گذرتا ہے تری یاد کی داوی میں خیال غار زاروں میں کوئی برہنہ پا ہو جیسے

یقین عشق فردا نہیں، تو کچھ بھی نہیں
نظر میں صبح کا جلوا نہیں، تو کچھ بھی نہیں
نہ درد و زیست، نہ صبح نظر، نہ ذوق جمال
جنوں کے بھی نہ ہوئے کچھ، خرد سے بیگانے
اسخیں صلا دو، بلا کر شراب کم نظری
کر سنگ و خشت سے رکتے نہیں یہ دیوانے

جب ترا ختم بھی ساتھ ہو چکا مجھ پہ گذری ہیں کسی رتیں بھی
دل تری یاد میں ہر لمحہ تڑپت بھی نہیں بند ہو جائے تڑپنا، یہ گوارا بھی نہیں

وہ نہیں پاس، تو احساسِ رفاقت ہے سوا
 غمِ تنہائی کے زنداں میں ایسے تنہا بھی نہیں
 کرتوں تیں ترکِ تمنا کا ارادہ، لیکن
 تھری ہے، وہ فتنہ مستم آرا بھی نہیں
 جب تم نہیں تو نہ ہر میں دنیا کی لذتیں
 کیسی بہار، آگ، لگا دو بہار میں
 بزار رنگ میں غزلیں کہیں، مگر اے دوست! تسری نگاہ کا پسیرا یہ بیاں نہ سلا
 ہمنشیں! نکھت بر باد کا ماتم کب تک! پھول ہر روز تو کھلتے ہیں گلستاںوں میں
 نشا جانفسہ بھی کیوں بن گئی نکلاں جیسے
 جہیں ہے سینہ احساس میں سناں جیسے
 خیال بنتے ہیں مٹتے ہیں، پھر ابھرتے ہیں
 پاپا ہے دل میں کوئی محشر نہ ہا جیسے
 وہ تیرا ہیر بن سسرخ، وہ خرامِ جواں
 سفینہ رنگ کے دریا میں مہر وال جیسے
 آنکھیں کھلیں، تو دھوپ نے لے لی تھی وہ جگہ
 سوئے تھے تیرا سایہ دیوار دیکھ کر
 نہ ہریم دوست نہ کنجین اندر سے نگار
 فریبِ شوق میں لب تک گذر رہی ہے بہار
 ابھی اڑا تھا مری چشم آرزو سے خبار
 انہیں کو وقت نے سونپی ہے آج راہبری
 کہ جن کے نقشِ تدرم سے ہیں راستے بزار

حفیظ ہوشیار پوری، شیخ عبدالحفیظ سلیم

الحرم حفیظ اپنے آبائی وطن ہوشیار پور کی نسبت سے مشہور ہوئے، لیکن ان کی ولادت ۵ جنوری ۱۹۱۲ء (۱۵ محرم ۱۳۳۰ھ) کو دیوان پور تحصیل جھنگ، پاکستان میں ہوئی تھی، جولائی ۱۹۴۷ء سے دس بارہ میل کے ماصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب حکومت پنجاب نے منٹگری، لائل پور، جھنگ وغیرہ کے مغربی اضلاع میں آباد کاری کا کام شروع کیا تھا۔ یہ علاقہ پہلے بنجر اور بالکل غیر آباد تھا۔ حکومت نے یہاں صاحب زمینداروں اور ان اشخاص کو جن کی کچھ سرکاری یا فوجی خدمات تھیں، بڑے کسبے پمانے پر جاگیریں عطا کیں اور انھیں خاص مراعات دے کر علاقے کے آباد کرنے کی ترغیب دی۔ عبدالحفیظ کے خاندان کی مالی حالت کسلی بخش نہیں تھی۔ ان کے والد شیخ فضل محمد خان تلاش روزگار میں وہاں گئے تھے کہ ممکن ہے کسی زمیندار کے ہاں کچھ لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہوئے اور یوں انھوں نے دیوان پور میں سکونت اختیار کر لی۔

شیخ فضل محمد خان کے تین بیٹے تھے، عبدالرشید، عبدالحفیظ، عبدالجید۔ عبدالرشید وہی ہیں، جو دنیا نے ادب میں داخل ہوشیار پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ تاریخ گوئی میں خاص طور پر ان کی مہارت سلسلہ تھی۔ ان کی اردو فارسی کی تعلیم معقول طریقے پر ہوئی تھی اور اس میں وہ اپنے نانا شیخ غلام محمد کے شاگرد تھے۔ جو برائی وضع کے اچھے عالم تھے۔ شیخ عبدالرشید کچھ عجیب مراقباتی مزاج کے

شخص تھے بسنا ہے کہ دن رات گھر کے ایک کمرے میں گوشہ نشین رہتے، اور بہت کم باہر نکلتے تھے۔ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے اور جو شخص کھانا لاتا، اسی کے ہاتھ رفوع بھیج کر اسے کچھ پینے پینے کی ضرورت ہوتی، تو کار براری کر لیتے۔ اگر کبھی کمرے سے نکلنا منظور ہوتا، تو رفوع بھیج دیتے کہ میں فلاں دن، اتنے وقت کے لیے ابراہیم کو نکال دوں گا اور فلاں فلاں شخص سے طوٹیکا، اور اس کی سختی صہا بندی کرتے سب سے چھوٹے عبد البعید کی تعلیم بھی معمولی تھی اور اس کی زندگی بھی بہت غیر منظم تھی۔ گھر کے لوگ ہمیشہ اس کے اطوار سے بہت نالاں رہا کیے۔

عبد الحفیظ کی دسویں درجے تک کی تعلیم اسلامیہ اسکل ہوشیار پور میں ہوئی۔ اس کے بعد وہیں گورنمنٹ اسٹرکالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ حال آں کہ ملی حالات اعلیٰ تعلیم کا بار برداشت کرنے کے قابل نہیں تھے، اس کے باوجود انھوں نے تہیہ کر لیا کہ تعلیم ضرور مکمل کر دینگا۔ چنانچہ لاہور چلے گئے اور گورنمنٹ کالج کے بی۔ اے کے درجے میں داخلہ لے لیا۔ لاہور میں سب سے مشکل مرحلہ سکونت کا تھا۔ یہ اس طرح حل ہو گیا کہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے انھیں اپنے ہاں رہنے کی اجازت دے دی۔

حفیظ کے ایک مامون شیخ دین محمد تھے۔ ان کا ہوشیار پور ہی میں کپڑے کا کاروبار تھا اور وہ خامے تنول آدمی تھے۔ وہ کبھی کبھی کچھ سلوک کر دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ لاہور میں حفیظ کا تعلیمی زمانہ بہت فسرت میں اور جنگی ترش سے بسر ہوا۔ بسر اوقات کے لیے وہ خالی اوقات میں نجی طور پر طالب علموں کو پڑھاتے اور بعض رسائل و جرائد میں بھی اجرت پر کام کرتے۔ اسی زمانے میں ان کا قلم العلماء سید ممتاز علی (ف جنوری ۱۹۳۵ء) کے ادارے دارالاشاعت اودان کے پرچہ بھول سے تعلق پیدا ہوا۔ بالآخر انھوں نے ۱۹۳۳ء میں بی اے اور ۱۹۳۶ء میں ایم اے (فلسفہ) کی اسناد لیں۔

۱۹۳۶ء ہی میں میاں بشیر احمد (ف مارچ ۱۹۷۱ء) ایڈیٹر ہمایوں نے ”انجمن اردو

پنجاب کی بنیاد رکھی تھی۔ حفیظ تعلیم سے توفارغ ہو ہی چکے تھے، اس انجمن کے نائب۔
سکتر مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ”ادنیٰ دنیا“ اور چراغ حسن، مسرت کے
”نکد ان“ کے ادارہ تحریر سے بھی منسلک رہے۔

۱۹۳۰ء میں سید امتیاز علی تاج اف اپریل ۱۹۶۰ء نے انہیں پھول اورد ہزمیر
فسوان کے ادارہ تحریر میں لے لیا۔ اس کے کچھ مدت بعد ہفتہ وار ”یاسنا“ نامی
میں جگہ مل گئی، تو یہاں پہلے آئے۔ یکس ہندو جسکی اور چند ماہ بعد واپس لاہور
پہلے گئے۔

اب ان کا کام اور نام غیر معروف نہیں رہا تھا۔ چنانچہ بعض اصحاب کا واسطت
سے ۱۹۵۰ء میں ریڈیو کے ٹھکانے میں ملازمت مل گئی۔ اور وہ پروگرام اسسٹنٹ
بن کر رہ گئے۔ اسی سلسلے میں چند سے ان کا پیام بھیجی میں بھی رہا تھا۔
پاکستان بننے کے بعد پھر اسی عسکے میں قنونوں لاہور میں قیام رہا۔ جون
۱۹۵۳ء میں دوسری مرتبہ کراچی میں تقرر ہوا، اور زمینہ بزمینہ ڈھائی
ڈائریکٹر جنرل لے ہمد سے منسلک پہنچے۔ وہیں سے ۱۹۶۰ء میں ملازمت سے سبکدوش
ہوئے۔ اس کے بعد بھی اپنی وفات تک ریڈیو پاکستان کی دینی نشریات
کے مشیر رہے۔

انہیں نفس کا عارضہ بہت ان سے تھا۔ ابھی بھی حالت زیادہ خراب ہو جاتی تھی۔
جولائی ۱۹۶۲ء میں شدید جلد بڑا، تو اسپتال پہلے گئے۔ طویل علاج سے کچھ افتاد
ہوا تو گھر واپس آ گئے۔ لیکن دو تین دن بعد ہی حالت بگڑ گئی اور وہ دوبارہ
جناب اسپتال دکرچی پہنچے۔ وہیں بدھ کے دن ۱۰ جنوری ۱۹۶۳ء جمع گیا رہ
بچے انتقال ہو گیا۔ اسی شام جنازہ اٹھا اور ماڈسنگ سوسائٹی کے قبرستان
میں سپرد خاک ہوئے۔

کئی اصحاب نے تاریخ وفات کہی۔ ان میں سے بیشتر کو ”آہ حفیظ خوش بیاں“ (۱۹۶۳ء)
میں تو اردو لہجہ پنجم محمد بن عرش ارسری کا قلمہ تاریخ ہے:

چرخ بست زیں جہاں بجانب جہناں حفیظ
 غم فراق ترکہ داد بہر دوستان حفیظ
 برائے سالی رملتش بکنج فکر پا ز دم
 نہ آتف آدائیں نہ لاکہ آہ غرض بیاں حفیظ
 (۱۹۷۳ء)

صلاح الدین گورمہ زین کا قطعہ ہے :

کر گئے تاراج بزم علم و فن عبد الحفیظ
 اب کہاں سے لائیں گے ان کی زباں ان کا قلم
 شاعر شیریں نوا، روح ادب، جان غزل
 یہاں تہ سیاں ہو کر چلے سو سے عدم
 سن رہاں بیل باغ جناں سے سالی مول
 اور کہہ دے شادیں عبد الحفیظ اندر ازم
 (۱۹۷۱ء + ۱۹۷۳ء)

۲

حفیظ کی طبیعت شروع سے خشن پرست تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ خسر گوئی کی طرف مائل ہو جاتے۔ اولاً انہوں نے بھی اپنے نانا شیخ غلام محمد سے استفادہ کیا۔ جب ۱۹۳۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا، تو اپنے بڑے بھائی شیخ عبد الرشید رحیل سے رجوع کیا۔ لاہور پہنچے، تو یہاں انہیں حلقہ دار بابہ ذوق کے نامودار اکبیر کی صحبت نصیب ہوئی، خاص طور پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سید احمد شاہ بخاری پطرس کی سرپرستی تھے ان کے ادبی ذوق پر چلائی، یہ دونوں کالج میں ان کے استاد بھی تھے۔ پطرس کی ترغیب پر انہوں نے انگریزی ادب کا بھی وسیع مطالعہ کیا، بلکہ علامہ علی کے دور میں انہوں نے انگریزی میں بھی کچھ نظمیں کہی تھیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے بچوں کے لیے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے، جو ”درنگی“ کے عنوان سے غالباً دارالاشاعت نے شائع کیے تھے۔ اس میں اصل انگریزی نظمیں بھی شامل ہیں۔

اول بہت دلیل تک سلیم تخلص کرتے رہے۔ بعد کو معلوم نہیں، کیوں اسے ترک کر دیا اور حفیظ تخلص اختیار کر لیا۔ وہ غزل اور نظم دونوں کہتے تھے۔ اوائل میں انہوں نے کچھ گیت بھی لکھے، بلکہ کسی زمانے میں وہ سیاسی نظمیں بھی لکھتے

رہے جو تھے وہ میں مہراور سالک کے روزانہ اخبار ”انقلاب“ (لاہور) میں جو نظمیں ”انقلاب“ کے خاص شاعر کے قلم سے ”چھپی گئیں، ان کے لکھنے والے حفیظ اور احمد ندیم قاسمی تھے۔ (ندیم کو چاہیے کہ وہ تعین کر دیں کہ ان میں سے کون سی نظمیں حفیظ کی ہیں)۔ لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا اصل میدان غزل تھا۔ ان کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ کے علاوہ نثر کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔ ان پر میر کا اثر ضرور تھا، جو زبان کی سادگی، لہجے کے دھیمے پن اور تحت الشعور کی فنا کی اور افسردگی سے عبارت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی انفرادیت نے ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی شستگی، شایستگی اور شیرینی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے برابر بزرگ کی طرح تاریخ گوئی میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا۔ یہ تکلف، تعصیب یا نثر جہ کے بغیر مکمل تاریخ نکالنے سے تھے۔ وہ یحسد دُردگو اور رحبتہ گو تھے، لیکن ہر گو نہیں۔ فی البدیہہ پیروڑی اور ہزل کہنے میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ اپنے قریبی اور مہراور دوستوں کی محفل میں خوب چبکتے تھے۔ غالباً یہ کلام محفوظ نہیں رہا۔

مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا تھا۔ انھوں نے اسے دو جلدوں میں مرتب کر لیا تھا! ہر ایک جلد میں بیس بیس سال کا انتخاب تھا اور کلیات کا نام انھوں نے ”زیر لب“ رکھا تھا، یہ نام بعد کو ایک اور صاحب نے اڑا لیا اور اپنی پوری کے خطوط اس عنوان سے شائع کر دیے۔ اس پر معاملہ پھر کشائی میں پڑ گیا۔ بہر حال یہ دونوں حصے ان کی وفات کے بعد ایک جلد میں ”مقاہزل“ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ (گراچی ۱۹۷۳ء) اس میں صرف غزلیات کا انتخاب ہے۔ تاریخوں کا مجموعہ الگ شائع ہو گا۔ انھوں نے کسی زمانے میں سندھی کا ڈبئی کی فرمائش پر سیرانجھا کے قصبے پر مبنی سندھ میں تصنیف کردہ چارندسی ٹنویاں بھی مرتب کی تھیں! یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے (گراچی ۱۹۷۷ء)۔

اولاد جسمانی میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بڑی بیٹی (مید حفیظ)

نے امریکا سے ڈاکٹر ریٹ کی تھی، وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات سے منسلک ہے۔ دوسری بیٹی (شمینہ) ریڈیو پاکستان میں ملازم ہے۔ تیسری کلثام عصمت ہے۔ لڑکوں کے نام صہیب اور عمیر ہیں۔

حفیظ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے کچھ نظمیں ضرور لکھیں لیکن بعد کو یہ میدان یکسر ترک کر دیا۔ جو کلاسیکی رچاؤ، وقار، رکھ رکھاؤ انھوں نے اپنی غزل میں نمایاں کیا، وہ ان کے معاصرین میں سے بہت کم شعرا کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی وضع داری اور کردار کی استواری کا یہ اعجاز ہے کہ نظم کے اس سیلاب میں جو ان کے چاروں طرف رواں دواں تھا، اور جس میں ان کے تمام دوستوں کے پاؤں ڈھنگا گئے، وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے۔ نمونے کے چند شعر دیکھیے :

غاشی ہے زبانِ عشقِ حفیظ !	حسن اگر بدگماں نہ ہو جائے
دیگی میں جفا نہیں کبھی بہت عشق میں، لیکن	اب کچھ کبھی نہیں دل کو بجز مہر و وفا د
یہ ترکِ محبت ہے کہ تجھ پر محبت	پہلے سے کبھی آنے لگے وہ تجھ کو سوا یا د
تو میں یہ حال تھا، گویا	اک شکل تھی پہچانی ہوئی، نام نہ تھا یا د
جب کھل آنکھ نیرال ان کا، لگی آنکھ تو خراب	بڑی مشکل سے بسر رات ہوئی ہے مجھ سے
کہاں سے لاؤں عمر جاودانی	ترا پہاں سہمی پہاں محکم
محبت کو دعائیں دے رہا ہوں	کہاں میں، اور کہاں یہ دولتِ تم
کوئی دیکھے ہماری سادگی کو	بڑھاتے جارہے ہیں رابطہ باہم
کبھی تم یاد آتے ہو، کبھی دل یاد آتا ہے	ہر اک گھبرا ہوا نزل، نزل یاد آتا ہے

عشق اک کیف ہے جس میں نہ مکاں ہے نہ ریاں

کوئی آنکھ نہیں تھا، کوئی آنکھ نہ تھی

محبت کی حقیقت ہے حفیظ! اس کے سوا کیا ہے

بہت مشکل تھا جینا، اس کو آساں کر دیا ہوں میں

پرمہا کسی نے حالِ نورک رک کئے ترانام سہرِ مثال کو ششِ ناکام آگیا

دیکھا جو پریشاں حال مجھ، اس جانِ محبت نے یہ کہا

ہم نے بھی کیا ہے عشقِ ہنگر ایسا تو ہب را حال نہ تھا

خشبِ فراق جو زمیند آگئی، تو کیا ہوگا کوسیلِ نور مرے بامِ در سے گزرا ہے

انہیں بھی آگیا شاہد یقیں ترکِ محبت کا

طبیعت ان سے مل کر اب پریشاں کیوں نہیں ہوتی!

میاںِ عشقِ وہیں ہے مقامِ قلب و نظر یہ عشقِ حینِ حقیقت نہ ہے ہوسِ باطل

سنا رہا ہوں برنگِ غزلِ زمانے کو حکایتِ نیمِ دوراں، فناۂ غمِ دل

میں ہوں گناہگار گناہوں کا ذکر کیا کچھ حیر کے طفیل ہیں، کچھ اختیار کے

دی سے دیں جنگِ آزما ہے، کفر سے آزاد وہ کفر

میری باہو سی نزا پہ کفر و دیں تک ہی نہیں

دامنِ صحرابھی ہے، اور دامنِ افلاک بھی

اب جنوں محدود حیبِ رآستیں تک ہی نہیں

غم کی چنگاری ازل سے اب دگل میں تخیِ محفیظا

سلسلہ اس کا نچو اڑ لیں تک ہی نہیں

میری حالت پہ نہ جا دیوں بھی ہو اگر تا ہے پوچھنے والے اکوئی بات اگر ہو تو کہوں

جب کبھی ہم نے کیا عشقِ ایشیاں ہوئے زندگی ہے، تو ایمن اور پریشیاں ہو گئے

خیالِ ترکِ محبت سے کاسپ امتحان ہے وہ دل جو تیری محبت میں کامراں بھی نہیں

قصہ ہوا ہو نہیں، سکونِ قلب کہاں سکونِ قلب وہاں بھی نہ تھا یہاں بھی نہیں

ابھی ابھی وہ گئے ہیں، مگر یہ عالم ہے بہت دلوں سے وہ جیسے نظر نہیں آئے

کہیں یہ ترکِ محبت کی ابتدا تو نہیں وہ مجھ کو یاد رکھی اس قدر نہیں آئے

عقیدہ نہیں، ظرف کی بات ہے وہی شے حلال، اور وہی شے حرام

غرض ہو کوئی اُس میں خال، محفیظا! تو مجھ پر ہے درِ محبت حرام

کیوں اماں نہ ملی گوشہٴ قفس کے سوا وہ طائروں پہ سرِ شاخساں گزری ہے
خزاں نصیب یہ سمجھ کر انگٹی ہے بہار حفیظ! جب بھی جنس سے بہار گزری ہے
دل کی دنیا اس قدر آہا و ہے جس قدر دیراں ہیں چشمِ دگوش و لب

اب ان کے حُسن میں، حُسنِ نظر بھی شامل ہے
کچھ اور میری نظر سے نکھر گیا کوئی
کسی کے پاؤں کی آہٹ کہ دل کی دھڑکن تھی
ہزار بار اسٹھا، سوے در گنبا کوئی
اسٹھا پھر آج مرے دل میں اٹک کا طوفاں
پہراں کی راہ سے ہا چشمِ تر گیا کوئی
کوئی زمیں سے بھی پہنچائے آسماں کو پیام
پیام اہلِ زمیں کو تو آسماں سے ملے

جب خوشی پہ تکلم کا گماں ہوتا ہے دل پہ وہ لمحہ غم سخت گراں ہوتا ہے
دیکھا جاتا نہیں محرومیِ دل کا عالم جب غمِ عشق نصیبِ دگراں ہوتا ہے
اب تو پہلی ہی ملاقات میں ہر صورت پر کسی دیکھی ہوئی صورت کا گماں ہوتا ہے

مجھ پہ گزری تھی نہ وہ، آنجہ سے جدا ہونے پر
اتفاقاتِ ترے ملنے پر جو مجھ پر گزری
آج کچھ حال ہی ایسا تھا کہ لب تک آئی
ورنہ یہ بات مرے دل میں تو اکثر گزری
کیوں نہ، تیرے جو دل غم سے جدا ہیں، حفیظ!
ان سے ملنے پہ بھی حالتِ دہی اکثر گزری

مجموع ہو کے پھر تری محفل میں جا بیٹھنے ایسا ہو کے جو تری محفل سے آئے ہیں
قرارِ دل کو اند آسودگیِ نظر کے لیے یہ آرزائشِ قلب و نظرِ بشر کے لیے!
نظر سے حدِ نظر تک، ہمسام تار یکی یہ اہتمام ہے، اک دعدہٴ سحر کے لیے

جالے، کیا بات ہونے والی ہے دل پریشاں ہے آپ سے مل کر
 تمام عمر خراشتہ رہم لے کیا اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا
 کب ملتی ہے یہ دولت بیدار کسی کو اور میں ہوں گرونا ہے اسی دیدہ وری کا
 اب خائفہ و درسنہ و میکدہ میں ایک اک سلسلہ ہے قافلہ بنسیری کا
 دل میں ہونقظ تم ہی، تو آنکھوں پر نہ جاؤ آنکھوں کو تو ہے روگ پریشاں نظری کا
 وہ مجھ پہ مہرباں تھے، ابھی کل کی بات ہے اور سوچے تو مجھے زمانے گزر گئے
 ذیر و حرم کی منزلِ فتور ہے، حفیظ! ہم ان کی جستجو کے بہانے گزر گئے
 دعویٰ ترکِ محبت تو ٹری بات ہے، غیر بھول ہی جائیں تمہیں ہم سے نہ اتنا بھی ہوا
 کبھی دشمن چلے اور ہاتھ میں خنجر لیے نکلے
 کبھی احباب اٹھے اور کشنہ زیر آستین آئے

حفیظ! کوئی ہے تسکینِ خواب کا منکر یہ اور بات ہے، توفیقِ خواب ہی نہ ہے
 بھول گئے ان کی ہر اک بات کو ہم سے یہ اک کام بڑا ہو گیا
 ترکِ محبت ہی سہی اب حفیظ! فرضِ محبت تو ادا ہو گیا
 پھر آئیں حفیظ! یا نہ آئیں جو کہتا ہو آج ان سے کہ لے
 یہ خود فریبی کہ صبح ہوگی، تیز لیل و نہار تک ہے
 کہ انتہائے شبِ جدائی، طلوعِ صبحِ مزار تک ہے
 یہ عشق وہ دردِ جانستہاں ہے، کوئی نہیں رازدار جس کا
 کہ اس کی یورشِ غمِ نہاں سے ہمیشہ آشکار تک ہے
 چراغِ مہر و دونا جلے، مگر وہی نیسری کا پہرا
 سوادِ ذیرِ بتاں سے لے کر خرم کے قربِ حجاز تک ہے
 بقدرِ توفیقِ پہرہ دروہ، تعریفِ دردِ آرزو سے
 کہ ابتداً قہر یا رے ہے، تو انتہا آفتِ دار تک ہے
 دورا و قرب کا اتنا احساس کہ ابھی جیسے یہاں تھا کوئی

کہاں کا عشق کہ اب رسمِ دراہ بھی تو نہیں
 جو روزِ سختی وہ نکلے گاہ گاہ بھی تو نہیں
 عذابِ جاں ہی ہے عشقِ ایکن اس کے بغیر
 علمِ زمانہ سے کوئی پناہ بھی تو نہیں
 جب ابتداے محبت ہی بس کی بات نہ تھی
 تو اہلِ عشق پہ لازمِ نیاہ بھی تو نہیں

اشک آنکھوں میں ہیں، رُخسوا غمِ داری ہو گئی
 کتنی مشکل تر ہے غم کی پاسداری ہو گئی

کئی در کھلے بند ہوتے گئے دورِ سیکدہ باز ستا، باز ہے

مجھے قریب جلوہ نے دھوکہ دیا بہت دور جلوہ گہ ناز ہے

نثار سے ہیں وہ اک موہِ رنگِ سرتاپا یہ ننگِ پیرانی ہے دیلِ حُسدِ ن

دوستی عام ہے لیکن اے دوستِ دتا ہے بڑی مشکل سے

ہم کو ستر لے بھی گمراہ گیا راستے بھلے کئی منزل سے

دیر تک اک فسانہ سناتے رہے زونگارِ گمے آکے اک نام تک

ہر پیشِ افریت دیتا ہے، ہر ورد میں لذت ہوتی ہے

اور اس کے سوا ہم کیا مانیں، کیا چیز محبت ہوتی ہے

جب تک ہوئے نہ تلخیِ حیراں سے آشنا نا آشنا ہے، ترے لطفِ نہاں سے ہم

مجھ تو لبِ ہیں ساحلِ طوفانِ گفتگو دیکھو، تو آہے ہیں نظرِ یزباں سے ہم

ہزاروں غم ابھرتے ہیں تکِ حرفِ سلی سے پہلے غم اگر سودہ مرہم بھی ہوتے ہیں

پریشِ غم کا قریبِ مست پوچھو ان کی آنکھوں میں زباں ہو جیسے

دل سے آتی ہے بات لب پہ، حقیقتاً بات دل میں کہاں سے آتی ہے؟

وا مانڈ دیا ریتاں، راغدہ حرم خودنا شناس ہم ہیں، خدا نا شناس ہم

ترے لطفِ دگر م ہیں، تو بھی ہے تیری وفا بھی ہے

مگر کوئی مداوا، اس دلیِ بیستاب کا بھی ہے؟

فرقت کا کوروی، غلام احمد

ان کا خاندان یونی کے مشہور قصبہ کاکوری کا رہنے والا تھا۔ فرقت نے اپنے مجموعہ کلام "تاروا" میں اپنے جو مختلف حالات شامل کیے ہیں، ان میں مشہور نعت نگار مولوی محمد محسن کاکوروی (ف اپریل ۱۹۰۵ء) کو اپنا جدِ امجد لکھا ہے۔ ٹھیک رشتہ یہ ہے کہ محسن کاکوروی مرحوم فرقت صاحب کی نانی (ناندالہ شادی) کے سگے مامول زاد بھائی تھے۔ اس سے ثابت ہے کہ ان کا خاندان حمائدِ خطہ میں سے تھا۔ فرقت کے والد شوکت علی بنواڑی ڈیہہ اور سیر تھے۔ شوکت علی کی شادی جناب انیس احمد بھاسی کی مشیر سے ہوئی تھی۔ ان کا نام اشتام النساء (مرف شہزادی) تھا؛ وہ بھی فرقت کی رحلت کے چند ماہ بعد رگراے عالم بقا ہوئیں۔

اگرچہ فرقت نے لکھا ہے کہ وہ ۱۹۳۳ء میں پیدا ہوئے لیکن شمیم کرہانی صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ دو نا بآ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے کیونکہ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے شمیم صاحب کو بتایا تھا کہ میں ۴۲ سال کا بچہ کا ہوں۔ سرکاری کاغذات میں تاریخ ولادت میں اس طرح کی غلطی بالخصوص ٹرم بتانا عام ہے۔ میرے خیال میں بھی ۱۹۱۰ء کی تاریخ زیادہ قریب قیاس ہے۔ فرقت صاحب لکھنؤ، گولہ گنج (ہسپتال) میں ستوا لیس پیدا ہوئے تھے، اسی لیے وہ عمر بھر قوام کے پتلے اور کھڑور رہے۔ لیکن ان کا بچپن کاکوری میں گزرا۔

شوکت علی کے تین اولادیں ہوئیں، انتخاب، فاطمہ، غلام احمد (فرقت) احمد توفیق

طوی۔ بدقسمتی سے شوکت علی کا عین جوانی (۱۹۱۴ء) میں انتقال ہو گیا۔ مگر میں کچھ اندر دھتہ تو تھا نہیں، اٹا مالان کے لیے زندگی دشوار ہو گئی۔ باسے اشیش مسعود علی صاحب (توتیل دربار راجپور) آڑے آئے، انھوں نے پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، جس سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے میں کچھ مدد ملی۔ سسے کا راز نہ تھا، اشیشی ترشی سے لبر ہونے لگی۔ لیکن یہ ثروت لایحوت بچوں کی تعلیم کا ہار اٹھانے سے قاصر تھی۔

فرقت بڑے بے تھے، پہلے وہی تعلیم کی منزل کو پہنچے۔ بہت دن تک محلے کے ایک مولوی صاحب سے اردو فارسی پڑھتے رہے، بیس میں خرچہ برائے نام بھی نہیں تھا۔ پھر گورنمنٹ حسین آباد ہائی اسکول، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا۔ درمیان میں کوئی سال ایک کے لیے اپنے بڑے ماموں مولوی رئیس احمد عباسی کے پاس سلطانپور چلے گئے۔ عباسی صاحب وہاں عدالت میں منعم اور اپنے صاحبِ بیعت بزرگ تھے۔ فرقت پانچویں درجے میں تھے، جب وہ سلطانپور گئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی کا کیا علاج! اس نے یہاں بھی بھینا نہ چھوڑا۔ ابھی یہ ساتویں میں تھے کہ مولوی رئیس اللہ بھی التذکویہ سے ہو گئے، اور یوں وہ پھر ایک مرقبہ بے یار و مددگار رہ گئے، اور انہیں واپس لکھنؤ آنا پڑا۔ اس وقت عمر ۱۳-۱۴ برس کی ہو گئی۔ یہاں ان کا قیام محلہ بادچی ٹولہ کے ایک مکان میں تھا۔ لیکن آفرین ہے ان کی ہمت کو! انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا یا۔ اس زمانے میں لکھنؤ میں دو مقبول روزنامے ”ہمد“ اور ”حقیقت“ تھے۔ روزانہ علی القصباح اسکول جانے سے پہلے گی کوچوں میں پھر کر حقیقت کے سوسنا پرچے بیچ ڈالتے۔ اس سے روزانہ کم و بیش آٹھ دس آنے کی آمدنی ہو جاتی جو بالکل ناکافی تھی، لیکن بالکل کچھ نہ ہونے سے کچھ بہتر ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کا کام لینے کے لیے تنگ دودھ و شرواح کی قسمت یاد دہنی کر ان کی کم عمری کے باوجود کچھ کام دل گیا۔ اس سے تین روپیہ مہینہ ملنے لگا، جو اور نہیں تو اسکول کی فیس کے لیے کافی تھا۔

اس کے بعد انھوں نے ۱۶-۱۷ برس کی عمر میں ایک دوست کی شرکت سے کچھ کاروبار

بھی کیا۔ دراصل یہ سب پاپڑائیں اپنی تعلیم اور خاندان کی کفالت کے لیے روپیہ پیدا کرنے کے واسطے پیلٹا پڑنے لگے۔ لیکن مشکلوں سے ۱۹۳۱ء میں انٹر پاس کیا اور اب یہ اُنکی روزنامہ ”حقیقت“ کے نائب مدیر ہو گئے۔ جسے کسی زمانے میں آوازیں لگا لگا کر گلی کوچوں میں بچا کرتے تھے۔ وہ اس میں خبروں کے علاوہ مزاحیہ کالم بھی ”کعبہ گفروں“ کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔

تعلیم ہونے کا مکمل تھی۔ انھوں نے غالباً ۱۹۳۶ء میں پرائیویٹ طور پر لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی۔ سرکاری انیس احمد شاہی (ایڈیٹر مالک ”حقیقت“) نے جو ان کے حقیقی اسوں میں ہوتے تھے، اسی زمانے میں ایک ہفت روزہ ”انگریزی ٹریڈ کرسٹ“ جاری کیا تھا۔ انھوں نے فرقت کو اس کے محلے سے بھی منسلک کر لیا۔ لیکن یہ بدھ دو سال بعد مالی مشکلات کی سبب سے چڑھ گیا۔

اب فرقت نے اپنا ذاتی اخبار ”صد اوقت“ (ہفتہ وار) کے نام سے نکالا۔ یہ نشتم پشتم دو سال چلا۔ اس پر فرقت صحافت سے ایس ہو گئے۔ خیال کیا کہ کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کیا جائے۔ اس میں انھیں کہاں کہاں کے کنوئیں نہیں جھانکنا پڑے؟ درندہ کی کام سیکھا اور کٹائی کے کام میں بہارت پیدا کر کے حکومت کے سلائی کے کارخانے (شاہجہانپور) میں بطور نگران (سپر وائزر) ملازم ہو گئے۔ لیکن ٹیکسٹری کے گرد و نواح کے مخدوش حالات دیکھ کر طبیعت اُچاٹ ہو گئی۔ انھوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور وہیں یونیورسٹی کے دفتر میں لکھ کر لی۔ پھر وہاں سے لکھنؤ سکرٹریٹ میں منتقل ہو گئے۔ اسی قیام لکھنؤ کے دوران میں (۱۹۳۵ء) لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (تاریخ) کی سند لی۔ ۱۹۳۷ء کے زمانے میں وہ برہمن حکومت میں فیلڈ پوسٹی افسر کے دفتر میں غالباً کسی ضلع کے انچارج رہے۔

اب انھوں نے تعلیمی شعبے میں ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ اول، اواخر ۱۹۳۷ء میں ملیم کالج، کانپور میں تاریخ پڑھانے پر مقرر

ہوئے۔ ایک سال بعد ۱۱۹۴ھ کے آخر میں اینگلینڈ تک سکول، دلی میں آئے اور یہاں
 کئی تاریخ کے مدرس ہی کا مہمد ملا۔ بیس سے انھوں نے دو بار دایم اے (اردو) کا
 امتحان پاس کیا۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ کی سند لی۔ وہ آخر تک اسی سکول
 کی ملازمت میں رہے۔

جولائی ۱۱۹۴ھ میں ان کے ماموں مولوی انیس احمد جاسی (ف نومبر ۱۹۰۵ء) نے اپنی
 صاحبزادی رئیس بانو (عرف سرتو) ان کے مقرب نکاح میں دے دی۔ سات بچے
 موجود ہیں، طارق، توقیر، رافع، طیب اور تاج، پانچ بیٹے اور رعنا اور محبوبی دو
 بیٹیاں۔ ان کے چھوٹے بھائی احمد توفیق طلوی لاولد تھے، اس بے بڑی شہادتی
 انھیں دے دیا تھا۔ ابتدائی زمانے کی شہرت اور روزانہ رات گئے تک کام
 کرنے اور جاگنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نیند بہت کم ہو گئی تھی۔ بعض اوقات متواتر کئی
 کئی دن سوئے گزر جاتے تھے۔ اس سے موت مستقل طور پر مخدوش ہو گئی۔ مین
 معنواں مشابہ میں سل کا حمل ہوا اور منہ سے خون آیا۔ بارے، اس سے جان تو
 بچ گئی، لیکن دوسرا کالسا تھی بن گیا۔ نوراک میں گوشت سے کاٹا ابقنا ب تھلا
 صرف سبزی قرکاری کھاتے تھے۔ گرمی ہو یا جاڑا، ہمیشہ دونوں وقت ٹھنڈے
 پانی سے نہاتے اور یہ روزانہ کا معمول تھا۔

وہ بدھ کے دن ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے جہریاں بہار
 گئے۔ جمعہ ۱۲ جنوری کو وہاں سے ٹھنڈے کے لیے روانہ ہوئے۔ شب دوران سفر
 میں طبیعت یکایک خراب ہو گئی۔ ہفتے کی صبح ۱۳ جنوری) صبح گھاڑی مجلس راے
 پہنچی، تو ڈرتے ہیں ان کی لاش ملی چونکہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ لاش کس کی ہے،
 پوسٹ مارٹم کے بعد اسے بنارس کی اسلامی انجمن کے سپرد کر دیا گیا۔ ان لوگوں
 نے اس شام نہلاؤ سلا کر غنچ شہیدال، اردلی بازار کے قبرستان میں دفن کر دیا۔
 بیوی بچوں میں سے کسی کو غفلت تک دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مارا دیا، طبر میں محمد کو، وطن سے دور
دکھلی مرے خدا نے، مری پیکسی کی شرم

فرقت کا شروع یہ، اخباروں سے جو واسطہ پڑا، تو اس سے انھیں مطالعے کا شوق پیدا
ہوا۔ جو دن، اسے جاب جاتے۔ آہستہ آہستہ خود لکھنے لگے۔ طبیعت میں چلبلاہیں تھا، اس
پے قدر تا مزاج کی طرف مائل ہو گئے۔ ”حقیقتہً بین کعبہ گلفروشش“ مزاحیہ کالم ان
کے حوالے ہو گیا، تو اس سے جہاں تلمذ وسیع ہو گئی، وہیں ذمہ داری کا احساس بھی
بڑھ گیا۔ وہ ترقی پسند معتقدین کی پیرا ہروی اور سطحیت کے مخالف تھے، ان کے
خلاف ان کا جہاد آخر تک قائم رہا۔ ان لوگوں نے بھی فرقت کو منہ نہیں لگایا اور
جنس اہمیت انھیں لانا چاہیے تھی، نہیں دی۔

فرقت کے مزاج کی جڑیں تو لازماً نوجوانی صحافت میں دھکی جاسکتی ہیں، لیکن ان کے
طنز نے فطری تلابازیوں سے، جو نوجوانی اخباروں کا قرۃ العین تھا، آگے گزر کر اس
میں گہرائی اور مقصدیت پیدا کر دی تھی۔

انھوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا، اور اس میں آرزو لکھنوی
(دف اپریل ۱۹۵۱ء) سے مشورہ کیا۔ استاد کے زیرِ اثر وہ ۱۹۳۶ء تک سنجیدہ شعر
کہتے رہے۔ لیکن طبیعت کی جھولانی نے اس کے بعد مزاج کے میدان میں پہنچا دیا۔
ان کی بعض مطبوعہ کتابوں کے نام یہ ہیں:

مداد (۱۹۴۲ء)؛ ناروا (۱۹۴۶ء)؛ کعبہ گلفروشش (۱۹۵۵ء)؛ مردہ دل کیا خاک
جیا کتے ہیں؛ مسدود ہف؛ خوشیِ تحریر؛ اردو ادب میں طنز و مزاح (۱۹۴۳ء)؛
مزاحیہ شریح دیوانِ غالب (۱۹۴۳ء)؛ غالب خستہ کے بغیر (۱۹۷۰ء)؛ قد چمے
(۱۹۷۱ء)؛ ایک آدم کو مجھو کر یہ سب کتا میں لکھنؤ سے شائع ہوئیں۔

مندرجہ ذیل چند شعرا ان کی آخری بیباکی سے ملے گئے ہیں اور ان میں سے غالباً
بیشتر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں،

نئی جیل، بس حوالا ستہ ہوگی ہر اک رات نفرت بھری رات ہوگی

بہنم میں جانے کی اتنی خوشی ہے کہ سب شاعروں سے ملاقات ہوگی

جب ستار زندہ تو اڑا رکھا تھا مرحوم ہوئے
اب جو مرحوم ہوں، فرماتے ہیں حال اچھا ہے
پناکلی قسمن وہ بکشت طلب کر بیٹھے
ان نے طنز آجر کہا میں کے کہ حال اچھا ہے
اپنے عشاق سے سب رنمایاں شادی کر لیں
ہر سے باپ کی خواہش، یہ خیال اچھا ہے
ماں میں، باپ مرے، شیخ الکشن دے
اک برسن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

شیخ بی اس بے فو تو نہیں گھنواتے ہیں تاکہ حوری کہیں پہلے سے انہیں دیکھ نہ لیں
اور جب مر کے بعد شوقی یہ جنت پہنچیں تو وہ اندر سے کوڑے نہ متقل کر دیں
جتنے شاعر ہیں وہ عشاقی صنم ہوتے ہیں شعر بہ کرم معشوقی میں سدا دتے ہیں
لیکن اک بات یہ اب تک نہ سمجھ میں آئی گھر میں کیوں جا کے یہ پوری کے قدم چھو نہیں

عشق اور عشق کی مل جمل کے بسر ہو کیسے
دسل آساں ہے بہر حال، مگر ہو کیسے!
قوس شکر کا ہے، محبوب بھی کہتے ہیں بجا
ایسی حالت میں کورنی شیر و شکر ہو کیسے!
شیخ جی محسن گئے جنت میں نہ جانے کیسے
اور پھر دال سے نکالے گئے جیسے جیسے
پوچھا لوگوں نے، حضرت! آپ ہلٹ کیوں لگے
بوسے، دال بھی ہیں بوسنیں لوگ تجھ ایسے دے

عشق کو غفر کیا، آج کے نوجوان نے صبح سے عاشقی پل اشب کو نام ہو گئی
آپ سے سب کو پیار تھا، آپ رسم و رواج کی آپ کا عقد ہو گیا، بات نام ہو گئی

چمکے سے وہ تو پہل دیے عشق کے تیک ڈوبے عشق کی انتظار میں عمر تمام ہو گئی

آپ مجھے بُرا کہیں، باپ مگر نہ کچھ کہیں
آپ کی بات اور ہے، باپ کی بات اور ہے
قاتلوں کا ہے معاملہ، زندگی اور موت کا
ایک کی لات کھا چکے، ایک کی لات اور ہے
ہنک سے آنکھ لڑائی، کونسی پھر کس سر رہی
نصف نکاح ہو چکا، نصف کی بات اور ہے
اس بے حسن و عشق میں روزِ دل سے میر ہے
دولوں کے باپ لاپتہ، دولوں کی ذات اور ہے
عشق کے دم پہ بن گئی، جس نے تو ازنگ جو دی
آج کی جھوٹ اور ہے، آج کی رات اور ہے
عشق کے درد کی دوا، ایک نقطہ نکاح ہے
وہ ہے فراڈ جو کہے، رافو نجات اور ہے

اُدھار

ہم کو طرزدت جو کھڑے گھاٹ لی گئی پانچوں کی ناڈ کانوں کے ساحل سے جا لگی
چمکی پھران کو ہم نے بعدِ شوق یوں نکلی آیا کروادھر بھی مری جہاں کبھی کبھی

قرضے سے ڈاے تم تو پریشان ہو گئے

لو خوش ہو، بلین دین کے سلمان ہو گئے

دل نے کہا کہ مجھ کو کے نعرے لگا بیٹے تختی لگا کے بیٹھو پر اب مجھ کو جا بیٹے

یری کو ایک خط میں یہ لکھ کر ملا بیٹے بیٹے کو جھوڑ سہاڑ کے اب جلد آ بیٹے

آ جا بیٹے، تو دل کے ہا میں کو ٹوٹا بیس

قرضہ وہ لیں کہ اصل کبھی دیں نہ سود دیں

وہ قرض پھر لے ہیں کا اندک پہنا دا رو پہنے اسی سے لے مرے میں پر پڑی نگاہ

پھر ان کے بھاگنے کی ہی چوڑی نہ کوئی راہ سب کے لنگوٹی بندھ گئی، حالت ہوئی تباہ

یاد رہتا تھا نفساں کا، نہ موقع تھا آہ کا

جتنا پشما ہوا تھا، ہر اک قرض خواہ کا

قرضے پہ ہم نے ایک مکان ایسا لے لیا جس میں کہ دو طرف سے تھا جانے کا راستا

جہاں سارے قرض خواہوں کو اس کا پتہ چلا ہر فردے کے اپنا بھی کھانا آگیا

تھا اک طرف سے ضرر کہ تشریف لائے

سناتا کہہ رہا تھا کہ فائدے بجائیے

پہلی جراثی، ایک قیامت مہا گئی ریل سے کے قرض خواہوں کی کک فوج آگئی

یوں عاقبت کا راستا ہم کو دکھا گئی دل نے کہا کہ اٹھیے، حفت موت آگئی

ہر قرض خواہ حد ادب نا گھسنے لگا

دل اپنی منفعت کی دعا مانگنے لگا

ہر ست لاڈ لاڈ کے گرے لگے جو ہم گرایا دل، تو آیا طبیعت میں بیج و خم

بنیا بفل سے بولا کہ دلو ایسے رقم کچنے لگا غلبہ کہ کب سے کھڑے ہیں ہم

وہ رہ کے اپنی بوٹیاں ہم لوہنے لگے

اور خود کشی کی راہ نئی سوچنے لگے

پُر کیف زندگی ہے فقط قرض خواہ کی دنیا میں اس سے بڑھ کے سعادت کس کی

کچھ بد نصیب کرتے ہیں ان پر شرمی شرمی کیا جانیں وہ کہ چیز ہے کیا نا وہ زندگی

کتنی بھی ہے جڑاڑ وہی ہتھکڑی بھی ہے

گو بس میں مدد پہا ہے، مگر بے بسی بھی ہے

ہے قرض کی پریشان کہ لو اور بھی نہ دو دس بیس ہاتھ کھائی، تو دو چار خود دھرو

مرنے پہ قرض خواہوں کے چندے سے یوں نگو دھیلا نہ اپنا خرچ ہو، اس ٹھاٹھ سے مرو

لے کر رقم جو دو گے، تو بچنے نہ جاؤ گے

کس کس کا قرض حشر میں جا کر چکاؤ گے

چھ سات سال قرض کے پیسے نہ جب دیئے دس بیس سو درخورد تو یونہی ڈھلک جیسے
جوادہ سُرٹے تھے وہ بھی تھے کچھ ایسے کچھ بے بیس ہر دو کے بولے، ہفت: اہم تو اب پہلے
وہ ہم نے قرض خواہوں کی مٹی پسید کی
وہ خود تو مر گئے، پہ رقم ان کی رہ گئی

تضمین

اتحادیہ را در رسم اچھا چا ہے ڈیر سا پھر اس پہ ہیا چا ہے
”ہا ہے اچھوں کو جتنا چا ہے یہ اگر چاہیں، تو پھر کیا چا ہے“

منہ چھپانے میں ہے کیا فرزا نگی آئیے ہم بھی تو دیکھیں بانگی
”دستی کا پردہ، ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چا ہے“

بو چھو کرے سے کہ کیا ہے بغیر عید چھوٹے جل کر کہیگا، جل یزید
”منہ مرنے پہ چھو، جس کی امید نا امید اس کی دیکھا چا ہے“

ہم نہیں اس وقت نہ اب ماننے جب کس گہر دجواں کو کاٹتے
”غافل! ان رطلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چا ہے“

ہے بڑھاپے میں ہوس کی کوئی حد جب کہ گھر والی کیے بیٹھی ہو زد
”چاہتے ہو درخورد یوں کو اسدا آپ کی صورت تو دیکھا چا ہے“

محمد اکرام، شیخ

ان کا آبائی وطن وزیر آباد (ضلع گوجرانوادر، پاکستان) تھا جہاں ان کا خاندان متاثر تھا۔ یہ لوگ تجارت پیشہ تھے۔ لیکن اکرام صاحب کی پیدائش ۱۰ ستمبر ۱۹۰۰ء کو چھوٹے سے قصبہ چک جمبرہ (ضلع لاہل پور، پاکستان) میں ہوئی جہاں اس زمانے میں ان کے والد اپنے کاروبار کے سلسلے میں مقیم تھے۔ دسویں درجے تک تعلیم وطن ہی اکول، وزیر آباد میں پائی، اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج، لاہور میں داخلہ لے لیا۔ یہاں سے انھوں نے ۱۹۳۰ء میں ایم۔ اے کی سند لی۔ اسی سال انہیں ہول مردس کے مقابلے کے امتحان میں منتخب اور کامیاب ہو گئے۔ انگلستان میں انھوں نے ٹریننگ کے زمانے میں جینس کالج، آکسفورڈ میں تعلیم پائی۔ اس زمانے میں انھوں نے جرمن کا بطور ثانوی زبان کے انتخاب کیا اور اس میں بھی مہارت حاصل کر لی۔

وہ ۵ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو حکومت ہند کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کا تقرر بمبئی کے صوبے میں ہوا تھا۔ ۱۹۴۶ء تک وہ کیرا اور سورت اور پونا میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ضمنی بات یہی قابل ذکر ہے کہ انھیں مراٹھی زبان میں بھی اعلیٰ استعداد حاصل تھی۔ ۱۹۴۶ء کے نصف آخر میں وہ مرکزی حکومت کی وزارت اطلاعات و نشریات میں ڈپٹی سیکٹر مقرر ہو کر واپس آ گئے۔ وہ اسی عہدے پر تھے جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد اور تقسیم ہوا ہے۔ اس پر وہ پاکستان منتقل ہو گئے۔

پاکستان میں بھی وہ زیادہ تر وزارت اطلاعات و نشریات ہی سے وابستہ رہے۔

بالآخر ۱۹۶۶ء میں وہ یہاں سے سکٹری کے عہدے سے ہٹیں پر سبکدوش ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کچھ مدت کے لیے بورڈ آف ریونیو کے رکن اور ایک سرکاری ادارے کے صدر بھی رہے تھے۔ سرکاری ملازمت سے الگ ہونے کے بعد وہ اپنی وفات تک ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور کے مدیر اعلیٰ رہے۔

آخری دو ایک برس میں انہیں اختلاج قلب کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ اسی کے علاج کے لیے ہوا اسپتال، لاہور میں داخل ہوئے تھے، جہاں بدھاء اجوری ۱۹۷۳ء کی شب میں رات ہی ملکِ عدم ہو گئے۔ جنازہ جمعرات کی سہ پہر میں اٹھا۔ لاہور کے مشہور قبرستان ”میاں صاحب“ میں سپردِ خاک ہو گئے۔ وسیع حلقہٴ احباب کے علاوہ اپنے پیچھے تین لڑکے اور ایک لڑکی کو گواہوں میں چھوڑے۔

ملازمت اور حکومت میں اعلیٰ عہدے اپنی جگہ، لیکن دراصل ان کا مزاج علمی اور تحقیقی تھا۔ مطالعے اور علم و ادب کا شوق ان کی گھنٹی میں پڑا تھا۔ گورنمنٹ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں وہ کالج کے ماہانہ رسالے ”راوی“ کے بہر قلم و قلم کے مدیر رہے۔ اسی زمانے میں ان کے کچھ مضامین جمعہ پرنٹوں میں بھی شائع ہوئے۔

دہ پونامیں تھے، جب انہوں نے ۱۹۳۶ء میں غالب نالہ کے نام سے غالب کی سوانح عمری شائع کی۔ میرزا کی سیرت کے بارے میں یہ پہلی علمی کوشش تھی۔ اس کے ساتھ انہوں نے میرزا کے اردو اور فارسی کلام کو بھی تاریخی ترتیب سے جمع کرنے کی کوشش کی اور اسے ”ارمغانِ غالب“ کے نام سے الگ شائع کیا۔ دونوں کتا ہیں بہت مقبول ہوئیں۔ بعد کو سوانح اور نقدِ کلام کی الگ الگ جلدیں ”میاتِ غالب“ اور ”کیم نسر زاد“ کے نام سے چھپیں۔ پھر اسی انداز پر مولانا شبلی نعمانی کی سوانح حیات ”شبلی نامہ لکھی جو بعد کو مستریدہ اضافوں کے ساتھ ”یادگارِ شبلی“ کے عنوان سے دوبارہ شائع ہوئی۔ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی تمدنی اور ثقافتی، علمی اور مذہبی تاریخ الہی کے علماء اور مفکرانوں کے سوانح اور سیرت

کے آئنے میں تین جلدات میں مرتب کی (آب کوثر: رود کوثر: موج کوثر) ایک ضخیم جلد میں ”پاک و ہند میں مسلمانوں کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ“ ۱۱ انگریزی میں شائع کی تھی جس کا انگریزی خلاصہ بعد کو پروفیسر انسلی، ٹی، ایمری نے ہندوستان میں مسلم ثقافت کے نام سے شائع کیا تھا۔ انھوں نے اسے ”آزاد الہیرونی کے فرضی نام سے ایک اور انگریزی کتاب MAKERS OF PAKISTAN (پاکستان کے معمار) کے نام سے بھی لکھی تھی۔ بعد کو یہی کتاب خاصے رد و بدل کے ساتھ MODERN MUSLIM INDIA & BIRTH OF PAKISTAN کے نام سے شائع ہوئی۔ اس موضوع پر غالباً بہترین کتاب ہے۔

۱۹۴۹ء میں ۱۶ یا شاید ۲۰/۱۹۵۰ء میں شہنشاہ ایران، پاکستان کے دورے پر تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر ان کی خدمت میں پیش کرنے کو اکرام صاحب نے ہندوستان، پاکستان کے فارسی شعرا کا انتخاب مرتب کیا تھا جو کتابت و طباعت کے خاص اہتمام سے ”ارمغانِ پاک“ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ان کی مجاور تصنیفات بھی اس ضمن میں سے بعض پر ان کا نام موجود نہیں ہے۔

ممتاز شیریں

ان کا آبائی وطن جنگلور تھا، لیکن وہ ۱۹۲۴ء کو میسور میں پیدا ہوئیں۔ دسویں درجے تک تعلیم بھی وہیں مہارانی ہائی اسکول، میسور میں پائی اور اس کے بعد مہارانی کالج، جنگلور ہی میں داخلہ لے لیا۔ یہیں سے ۱۹۴۲ء میں بی اے کی سند لی۔ وہ شروع سے سنجیدہ مزاج تھیں؛ چنانچہ بی اے میں ان کے مضامین، طعنائیات (سوشیا لوجی)، نفسیات (سائیکوجی)، معاشیات (اکنامس)، تاریخ اور فارسی تھے۔ طالب علم کی حیثیت سے وہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہیں، نہ صرف ہمیشہ ہر درجے میں اول آئیں، بلکہ انفرادی طور پر بھی ہر ایک معنوں میں سر فہرست رہیں۔ جب تقسیم ملک کے بعد پاکستان گئیں، تو وہاں کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی سند لی۔ یورپ جانے کا موقع ملا، تو چند ے آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید انگریزی تنقید کے اسباق میں بھی حصہ لیا تھا، لیکن وہاں سے غائب ہو کر کوئی سند حاصل نہیں کی۔ وہ آکسفورڈ میں دو برس رہ کر ڈاکٹر آف تھائری (ڈی ٹی) کی ڈگری لینا چاہتی تھیں، لیکن مالی عدم استطاعت نے اس کا موقع نہ دیا اور وہ واپس وطن چلی آئیں۔

۱۹۴۲ء میں بی اے پاس کرنے کے بعد ہی ان کی صہ شاہین سے شادی ہو گئی تھی۔ یہ رشتے میں ان کے عزیز بھی تھے، انھوں نے اسی زمانے وکالت کی سند لی تھی۔ اس شادی کا نتیجہ دو بچے ہیں: ہر دین اور گریز۔

صہ شاہین نے بعد کو ڈاکٹر بیٹ کر لی اور سرکاری ملازمت میں شامل ہو گئے۔

اس سلسلے میں انھیں یردن ملک کئی جگہ قیام کرنا پڑا۔ پہلے مغربی یورپ میں تقویٰ ہوئی، بعد کو سیٹھ کے صدر دفتر بشکاک (تائی لینڈ) میں پہنچ گئے۔ صدر شاہین بتدریج یورو آف ریفرنس اینڈ ریسرچ میں جاسٹ ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۵۴ء میں (تائی لینڈ کے دارالخلافہ بیگ میں ایک بین الاقوامی ادبی کانگریس منعقد ہوئی تھی ممتاز شیریں نے اس میں اپنے ملک کی نمایندگی کی تھی۔ وہ جہاں بھی گئیں، انھوں نے وہاں کے اربوں سے تباہ و برباد خیالات کیا اور اس سے ان کے فکر و فن کو بہت فائدہ پہنچا۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ پاکستان کی وزارت تعلیم سے بحیثیت مشیر منسلک ہو گئی تھیں۔

ممتاز شیریں کو ۱۹۷۲ء کے اواخر میں انٹریوں کے سرطان کا عارضہ لاحق ہو گیا؛ اور یہ نامراد مرض اتنی تیزی سے پھیلا کہ بروقت پورے طور پر علاج کا بھی انتظام نہ ہو سکا۔ فروری میں انھیں علاج کے لیے اسلام آباد کے پولی کلینک (ہسپتال) میں داخل کیا گیا۔ وہیں چند ہفتے بعد ۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو دون کے دو بچے (عمر ۴ سال) انتقال ہوئے۔ اسی شام تدفین عمل میں آئی۔

انھوں نے کالج کے زمانے ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا افسانہ ”انگڑائی“ ۱۹۴۲ء میں چھپا، تو لوگوں نے محسوس کیا کہ اردو کے افسانوی انق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ”ریپک رائے“ اور ”سیکھ لہار“ جیسے طویل افسانوں سے جہاں اردو میں نئے تجربے کئے وہیں ایک نئی روایت کی بنیاد رکھی۔ پھر انھوں نے ۱۹۴۴ء میں اپنے شوہر صدر شاہین کی میت میں بشکورت سے ”نیا دور“ (ماہانہ) جاری کیا اور اس میں ان کے تنقیدی مضامین بھی چھپنے لگے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ جتنی اچھی افسانہ نگار ہیں، اتنی ہی اچھی نقاد بھی ہیں۔ یہ پرچہ تقسیم ملک برابر شائع ہوتا رہا۔ اور جب وہ کراچی منتقل ہو گئیں تو وہاں سے شائع ہونے لگا۔ یہ ۱۹۵۲ء میں بند ہوا، جب صدر شاہین بسلسلہ ملازمت یورپ گئے۔

ان کے افسانوں کے دو مجموعے - اپنی نگریا (۱۹۵۵) اور حدیثِ دگر (۱۹۶۳) - شائع شدہ موجود ہیں۔ امریکی (انگریزی) مصنف ایسٹن بک کے ناول "دی ہلڈ" کا ترجمہ "دیر شہوار" کے عنوان سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے امریکی افسانوں کا ایک مجموعہ بھی اردو میں مرتب کیا تھا۔ اپنے تنقیدی مصنفین بھی "معیار" کے عنوان سے جمع کئے تھے۔ عنوان کا محبوب افسانہ نگار تھا۔ انہوں نے اس کے بارے میں ایک کتاب "فوری نہ ناری" (بھی لکھی تھی، جس میں فٹو کے افسانوں میں انسان کے تصور کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ آخری دونوں کتابیں غالباً آج تک شائع نہیں ہوئیں۔

ان کی وفات سے اردو نے ایسا مصنف کھو یا، جسے مخرق اور منسرب کے افسانوی فن پر برابر نہ قدرت حاصل تھی اور جس نے اردو افسانے کو سنزلوں آگے بڑھایا۔

شوکت سبزواری، سید شوکت علی

ان کے جدِ اعلیٰ غلیہ ہمد میں ایران کے شہر سبزواری سے (جو شہر اور نیشاپور سے مغرب میں ہے) نقل مکان کر کے ہندوستان آئے، اور یہاں ضلع بلند شہر (یوپی) کے قریب ایک پرانی بستی مرزا پور میں بس گئے۔ ۱۸۵۷ء میں اس علاقے کا امن و امان نہس نہس ہو گیا، تو سید شوکت علی کے دادا سید نیاز علی اور ان کے چھوٹے بھائی سید افضل علی کو اپنا وطنِ ثانی بھی ترک کرنا پڑا۔ سید نیاز علی کے دوسرے بھائی سید فضل علی اسی جنگاے میں انگریز کی گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس قافلے نے پہلے چندے بلند شہر میں قیام کیا، اور بالآخر میرٹھ میں رخت سفر کھول دیا۔

شوکت علی کے والد کا نام سید اسد علی تھا۔ گھر کی مالی حالت کمزور تھی۔ وہ کچہری میں کسی دکان کے ہاں محترم تھے، اور اسی بچے عوام میں فشی اسد علی کے نام سے مشہور تھے۔ اولاد میں ان کے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں تھیں، جن کے نام بہتر نسب و تاریخ ولادت یہ ہیں: جنت علی، عزیز خاظمہ، یوسف علی، اسلام خاظمہ، شوکت علی، یلغیس خاظمہ، کلثوم خاظمہ، صالحہ خاتون۔ گویا شوکت علی سبائوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اگرچہ بعض لوگوں نے ان کی تاریخ ولادت ۱۹۰۸ء لکھی ہے، لیکن قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرٹھ میں ۱۹۰۵ء/۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ سید اسد علی نے خامی طویل عمر پائی۔ وہ تقسیم ملک کے بعد تک زندہ رہے ۲۹۱ سے پندرہ مرزا پور سے مختلف جگہ رہے۔

۱۹۵۲ء کو میرٹھ میں رحلت کی۔

آخر ہرنانے کی روش کے مطابق خاندان میں اردو اور فارسی کا رواج تھا، اور ماحول بھی دینی تھا، لیکن گھر میں کوئی علمی یا ادبی روایت نہیں تھی۔ پیشے کے لحاظ سے یہ لوگ ملازمت اور سپہنگری کو ترجیح دیتے تھے۔ لہذا جب سن شعور کو پہنچے، اور ان کی تعلیم کی منزل آئی، تو سید اسد علی نے بڑے بیٹے خشت علی کو لے، دوی ہائی اسکول، میرٹھ صدر میں، اور پھر دوسرے یوسف علی کو بھی گورنمنٹ ہائی اسکول، میرٹھ مشہر میں انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کو بھیج دیا۔ بد قسمتی سے خشت علی کا تعلیمی دور بہت مایوس کن ثابت ہوا۔ وہ پانچ چھ برس دسویں درجے کے امتحان میں بیٹھتے رہے، لیکن پوری کوشش کے باوجود ۲۱ برس کی عمر تک پاس نہ ہو سکے۔ بات یہ تھی کہ اگرچہ اور تمام معامین میں ان کی قابلیت اپنے ساتھیوں سے کہیں زیادہ تھی، لیکن ریاضی میں وہ صفر کھینچتے۔ اس مضمون سے انہیں مطلقاً سن نہ تھا اور اسی میں وہ بار بار ریفیل ہوتے رہے۔ خوبی قسمت وہ انہیں دنوں عین عالم مشہاب میں رحلت کر گئے۔ کڑیل جوان بیٹے کی اچانک موت، سید اسد علی پر تو گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بھارے اس صدمے سے منحل ان کو اس سے ہو گئے۔ ایسے حالات میں انسان اکثر تو بہات کا خاکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ انہوں نے خیال کیا کہ ہوا نہ ہو، یہ مجھے بچوں کو انگریزی تعلیم دلوانے کی سزا ملی ہے۔ اس پر انہوں نے منجھلے بیٹے یوسف علی کو انگریزی اسکول سے اٹھا لیا۔

اس حادثے کا شوکت علی کی تعلیم پر بھی اثر پڑا، جو بڑے بھائی کی وفات کے وقت صرف آٹھ برس کے تھے۔ وہ خاصی بڑی عمر تک پڑھنے لکھنے سے محروم رہا۔ سید یوسف علی بفضلہ زندہ و سلامت میرٹھ میں موجود ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۷۰۔ ۷۱ برس کی ہے (زادات: ۱۹۹۰ء/۱۹۱۹ء)۔ پیرائے سالی کا معمولی سا آخر زبان پر ہے۔ غنیف ہی گفت سے قطع نظر، صحت عام طور پر اچھی ہے۔

رہے۔ بالآخر انہیں قرآن پڑھنے کے لیے ایک استانی کے حوالے کر دیا گیا۔ انہیں اردو پڑھنے کا بھی شوق تھا، لیکن اس کی کوئی تحصیل نظر نہیں آتی تھی۔ اتفاق سے ہشتی زیور کا پہلا حصہ انہیں سے ان کے ہاتھ لگ گیا۔ انہوں نے اپنی استانی سے درخواست کی کہ یہ مجھے پڑھا دیجیے، اور اردو لکھنا بھی سکھا دیجیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں تمہیں یہ کتاب تو پڑھا دوں گی، لیکن لکھنا نہیں سکھاؤں گی۔ ان کے وجہ دریافت کرنے پر کہلا کر استانی نے اپنے معزوم خاوند کی ہدایت کے تحت ان کی زندگی ہی میں لکھنے سے اجتناب کرنے کی قسم کھائی تھی۔ غرض کتاب استانی نے پڑھا دی اور اسکل سے انہوں نے دیکھو بکھو کر حرف شناسی کے بعد اردو لکھنا خود سیکھ لیا۔ اس طرح انہوں نے قرآن نافرہ ختم کر لیا، اور اردو میں بھی کچھ مشق بدھو گئی۔ اب والد نے ان کی آئندہ تعلیم کے بارے میں مسجد کے امام صاحب سے مشورہ کیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تم نے دونوں بڑے طرکوں کو انگریزی پڑھائی تھی، اب بطور کفارہ اس لڑکے کو عربی پڑھاؤ، اس سے تمہاری سات لپٹیں بخشی جائیں گی۔ اس پر شوکت علی میرٹھ کے مدرسہ امداد العلوم میں عربی فارسی کی تحصیل کے لیے بھیج دیے گئے۔

مدرسہ امداد العلوم، دارالعلوم دیوبند کی طرز کا مدرسہ آج بھی میرٹھ میں موجود ہے۔ اس زمانے میں اس کے صدر مدرس مولانا عبدالمومن دیوبندی معزوم تھے۔ وہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن (ف) نومبر ۱۹۲۰ء کے سالے تھے، احدث شاہ اور فقہ میں ان کی دور دور شہرت تھی۔ دوسرے اساتذہ میں مولانا اختر شاہ عربی ادب اور فارسی ادب میں ممتاز تھے، وہ اردو، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، منطق اور فلسفہ کے استاد مولانا عبد الرحمن تھے۔ ان فاضل اساتذہ کی موجودگی کے باعث اس زمانے میں اس مدرسے کو بہت بلند مقام حاصل تھا۔

شوکت علی نے ان سب استادوں سے بھرپور استفادہ کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کا نامی اور عربی کا ذوق بہت حد تک مولانا اختر شاہ کی صحبت کا اثر ہے۔

منت تھا۔ انہی مدرسے سے انہوں نے ۱۹۲۳ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۲۴ء میں منشی فاضل کے امتحان پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے پاس کئے، جو اس زمانے میں ان علوم کا مرکز تھا۔ منشی فاضل کے امتحان میں وہ اس سال کے جملہ طلبہ میں اول آئے تھے۔

والد کی خواہش کا احترام اپنی جگہ، لیکن ان سے چوری چھپے، انہوں نے انگریزی پڑھنے کا انتظام بھی کر رکھا تھا، اور یوں ۱۹۲۶ء میں انہوں نے انگریزی کے دوسرے درجے کی سند بھی امتیازی نمبروں سے حاصل کر لی۔

یہاں غالباً ایک واقعہ کا ذکر بہل نہیں ہوگا:

شوکت صاحب نے مولوی فاضل کا امتحان دومرتبہ پاس کیا۔ پہلی مرتبہ تو جیسا کہ اوپر لکھا، ۱۹۲۴ء میں، دوسری مرتبہ اس سے دو تین برس بعد۔ ہوا یہ کہ مولوی عارف اللہ پیش امام مسجد جامع کے رشتے کے چچا حافظ احمد میاں، مولوی فاضل کا امتحان دینا چاہتے تھے۔ لیکن امتحان کی کافی تیاری نہیں تھی، یا کیا بات، وہ امتحان میں بیٹھنے سے گھبرارہے تھے۔ شوکت صاحب نے ان سے کہا: آپ نکر نہ کریں، آپ کی جگہ میں امتحان میں بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ وہ احمد میاں کی جگہ امتحان میں شریک ہو گئے۔ لیکن کسی طرح بھانڈا سہوٹ گیا، ہر قسم امتحانات کو شبہ ہو گیا۔ تحقیق ہوئی اور یہ جلسہ بازی میں ماخوذ ہو گئے۔ مقدمہ چلا، اور سنرا ہوئی، اور ان کی مولوی فاضل کی سند ضبط کر لی گئی۔ اس لیے انہیں دوبارہ امتحان پاس کر کے یہ سند حاصل کرنا پڑی۔

منشی فاضل کا امتحان پاس کر لینے کے بعد انہیں مدرسہ عالیہ میرٹھ میں، مدرسے پر مشاہرے پر فارسی اور اردو کے مدرس کی جگہ مل گئی تھی۔ یہاں ان دونوں زبانوں کے علاوہ اس زمانے میں قرآن کی کچھ اہمیت دینی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ وہ اس مدرسے میں ۱۹۳۰ء میں گئے تھے اور ۱۹۴۱ء تک وہیں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے پرائیویٹ طور پر انٹر سے لے کر ایم اے (فارسی) تک کے امتحان

پاس کیے۔ ایم اے (فارسی) کا امتحان انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۳۷ء میں دیا، اور وہ اس سال کے کامیاب طلبہ میں اول آئے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے (عربی) کیا (۱۹۳۹-۱۹۴۰ء) میں انھوں نے مدرسہ عالیہ کی طرز مت کے دوران ہی میں میرٹھ کالج میں داخلہ لے لیا اور دو سال بعد یہاں سے قانون کی سند (ایل ایل بی) حاصل کی۔ اس دوران (یعنی ۱۹۴۲ء) میں وہ آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) سال اول کا امتحان پاس کر چکے تھے۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں وہ اسلامیہ انٹر کالج، بریلی کے شعبہ فارسی و اردو سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں وہ ۱۹۴۶ء تک رہے۔ اسی اثنا میں انھوں نے ایم اے (اردو) کے سال دوم کا امتحان دے کر سند حاصل کی۔ اس کالج میں تین برس تک کام کے بعد وہ میرٹھ کالج کے شعبہ اردو و فارسی میں آ گئے۔ میرٹھ آئے کا قصہ بھی دلچسپ اور قابل ذکر ہے۔

قیام بریلی کے زمانے میں انھوں نے غالب کا فلسفہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کیا۔ مضمون ان کے انداز سے طویل ہو گیا۔ وہاں کے ایک ناشر غلیل الرحمن مالک قومی کتب خانہ، بریلی ان کے لئے تھے۔ ایک دن وہ صبح معمول آئے، تو یہ بیٹھے مضمون لکھ رہے تھے۔ انھوں نے دریافت کیا: کیا لکھا جا رہا ہے؟ تو کہا کہ غالب پر ایک مضمون لکھ رہا ہوں، لیکن ختم ہونے میں نہیں آتا پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس پر غلیل الرحمن بولے: پھیلتا ہے تو پھیلنے دیجئے، اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے! یہ چاروں کا زمانہ تھا۔ اور سردی بڑے کڑا کے کی پڑ رہی تھی۔ اب غلیل الرحمن نے یہ معمول بنالیا کہ ہر دوسرے تیسرے آتے اور شوکت صاحب کے کھانے کو درجنوں انڈوں کا ڈیمر ساراٹھا ساٹھلا تے شوکت صاحب نے گویا یہ طوا کھا کھا کر مضمون منٹل کیا جو بڑے کڑا کتاب بن گیا، اور اسے غلیل الرحمن نے ”فلسفہ کلام غالب“ کے عنوان سے ۱۹۴۶ء میں شائع کیا۔ یہ شوکت صاحب

کی پہلی کتاب تھی۔

شوکت صاحب نے یہ کتاب میرٹھ کے ایک متول رئیس سیٹھ گوپی ناتھ کے نام منوں کی تھی۔ اس میں بھی مطلب سیدی دیگر شاہ سیٹھ صاحب موصوف کانگریس کے سربراہوں لیڈر اور میرٹھ کالج کی مجلس منتظرہ کے بااثر رکن تھے۔ اس کے بعد انھوں نے شوکت صاحب کو میرٹھ کالج میں ملازمت دلوا دی۔ یہاں وہ ۱۹۵۰ء تک رہے۔

اسلامیہ کالج، بریلی کی ملازمت کے زمانے میں ان کی وجاہت حسین حذیب شادانی (ف جولائی ۱۹۶۶ء) سے خامی دوستی ہو گئی تھی۔ حذیب شادانی ۱۹۲۸ء سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے پروفیسر تھے۔ شوکت سبزواری ہمیشہ قوم پرست رہے تھے اور سیاست میں ان کا میلان کانگریس کی حکمت عملی کے موافق تھا۔ اسی لیے وہ آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ہندوستان ہی میں مقیم رہے اور درحقیقت ان کا ہجرت کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لیکن ۱۹۵۰ء میں شادانی نے انھیں ڈھاکہ آنے کی دعوت دی۔ اُدھر تقسیم کے بعد کے زمانے میں یہاں اردو کے خلاف سرکاری اور غیر سرکاری روپے بھی ہندوستان نہیں رہا تھا۔ اس سے شوکت مرحوم کو یہ خیال ہوا کہ دیر سویر میری نوکری جاتی رہے گی۔ اس اندیشے نے انھیں شادانی مرحوم کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کیا، اور وہ ڈھاکہ چلے گئے۔ وہاں وہ صدر شعبہ اردو مقرر ہو گئے۔ یہیں سے انھوں نے ۱۹۵۲ء میں اردو لسانیات میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی ڈگری لی، جس کی تیاری وہ قیام میرٹھ کے زمانے سے کر رہے تھے۔ لسانیات کی طرف ان کا میلان بھی ایک حسن اتفاق کا کرشمہ تھا۔

ملک کی تقسیم اور آزادی کے قبل تک یہاں ہندو ہی مناظروں کا عام رواج تھا۔ ہندو، مسلمان، عیسائی ایک دوسرے کے خلاف بھی مناظرے اور شامت رائج کرتے رہتے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندرونی فرقوں میں بھی آٹے

دلچسپ مذاہبی دنگل ہوتے رہتے تھے۔ اس کے لیے لوگ بڑی بڑی تیاریاں کرتے، اور دور دور سے اپنے بھخیال حاملوں اور ودوانوں کو بلاتے تھے۔

جس زمانے میں شوکت مرحوم مدرسہ عالیہ میں ملازم تھے، ایک دن چند گریہ سماجی صدر مدرس مولانا عبدالمومن صاحب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ ہماری ایک مجلس مباحثہ ہے، جہاں ہم مسلمانوں اور عیسائیوں کو مناظرے اور بحث مباحثے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی مسلمان عالم کو مناظرے کے لیے بھیج دیں۔ مولانا عبدالمومن نے یہ دعوت قبول نہ کی؛ اور ان اصحاب سے کہا کہ یہ مناظرے بیسو درہیں، اور قبیح اوقات سے زیادہ نہیں۔ اس پر ان میں سے کسی نے کہا کہ اتنا بڑا شہر اور اتنے سارے مدرسے، ہم یہاں کے سب مدرسوں میں گئے، جہاں اسلامیات کی تعلیم دی جاتی ہے، لیکن تعجب ہے کہ کسی نے ہمارا چیلنج قبول نہیں کیا، آخر کہا بات ہے کہ کسی کو ہمارے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں ہوئی؛ شوکت صاحب بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ انہوں نے اس آریہ سماجی کی یہ بات سنی، تو غیرت آئی، جواب میں ان صاحب نے کہا کہ میں چلونگا۔ مولانا عبدالمومن بھی ان کا جوش دیکھ کر خاموش ہو رہے۔ اس پر ان صاحب نے پوچھا کہ آپ کس موضوع پر بحث کرنا پسند کرینگے؟ اور ساتھ ہی ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ دے دیا جس پر ہندی میں چند موضوعات کے عنوان لکھے تھے، شوکت صاحب کی ہندی سے واقفیت بڑے نام تھی، اس لیے وہ پرچہ پڑھنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے اپنی لاطینی پر یوں پردہ ڈالا کہ آپ جو موضوع چاہیں، میرے نام لکھ دیں، مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اس پر ان لوگوں نے مناظرے کے لیے ”روح اور آدے کی قدامت“ کے عنوان کا انتخاب کیا۔

اس مباحثے کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک ہندی اور سنسکرت کا باقاعدہ مطالعہ نہ کیا جائے، اس

سیدان میں کماحقہ کامیابی محال ہے۔ اس پرائسوں نے ایک پنڈت صاحب سے
ٹیوشن کے ذریعے سنسکرت سبقاً سبقاً پڑھی، اور ہندی مفکرین کی کتابیں
اور مذہبی ستون ان کی اصل زبان میں مطالعہ کیے۔ عربی اور فارسی وہ پہلے سے
جانتے سمجھتے سنسکرت کے علم نے انہیں ان زبانوں کے تقابلی مطالعے کی
قابلیت عطا کر دی۔

۱۹۵۹ء میں مشفق اصحاب و جوش ملیح آبادی، پیر حسام الدین راخدی، ڈاکٹر
ابوالہیٹ مدنی وغیرہ کی تحریک پر حکومت پاکستان نے اردو کا ایک مکمل تاریخی لغت
تیار کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کے سامنے آکسفورڈ ڈکشنری کا نمونہ تھا۔ اس کے
پچھلے حکومت نے کراچی میں اردو ترقی بورڈ کی تشکیل کی اور لغت کی ترتیب و تدوین
کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ اسی زمانے میں شوکت صاحب اولاً ڈھاکہ کے
ایک سال کی چھٹی لے کر کراچی آئے اور بطور ماہر اس بورڈ سے وابستہ ہو گئے۔
پھر شعبہ لغت کے مدیر اعلیٰ مولوی عبداللہ بنائے گئے اور ان کی مدد کے لیے
تین مدیر مقرر ہوئے: سید ہاشمی فرید آبادی (۱۹۶۴ء جولائی ۶۱)، ڈاکٹر شہید اللہ
(۱۹۶۹ء جولائی ۶۱) اور ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ اس پر وہ ڈھاکہ پر نورسٹی
سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن یہ انتظام بھی دو تین برس سے زیادہ قائم نہ رہا۔
اول ڈاکٹر شہید اللہ شگلہ اکاڈمی، ڈھاکہ کے صدر بن کر گئے۔ پھر سید ہاشمی
فرید آبادی کو کچھ حکومت وقت سے اور کچھ مولوی عبداللہ سے شکایات پیدا
ہو گئیں، اور وہ کراچی سے لاہور چلے گئے۔ اگست ۱۹۶۱ء میں خود مولوی
عبداللہ بھی جنت سدھارے۔ اب سارے کام کی ذمہ داری شوکت صاحب
کے کندھوں پر آ پڑی۔ وہ مدیر اعلیٰ بنا دیے گئے، اور آخر تک اسی عہدے
پر رہے۔ بیشک، ان کے ساتھ عملہ تھا اور ان میں سے بعض اہل زبان
اور زبان آدہ بھی تھے، لیکن واقع یہ ہے کہ اشتقاق اور تخریج کا کام شوکت
سبزواری کے سوا کسی اور کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ الفاظ کی تشریح

اور تحقیق میں وہ ایسی ہندی کی چند ہی نکالتے تھے کہ ان کے سب ہمارا ان کا لونا تھے تھے۔ انسوس کہ ان کی وفات سے قبل اس لغت کی ایک جلد بھی منظر عام پر نہ آئی۔ بہر حال آٹھ جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک ان کا نام زد رہے رکھے کو کافی ہے۔

شوکت سبزواری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری اور شعر گوئی سے کیا تھا۔ انھوں نے ہایوں تخلص اختیار کیا تھا۔ اس زمانے کے پرچوں میں ان کا کلام دستیاب ہو جاتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ لاہور کے ”اپنا“ میں ”اپنا دنیا“ میں چھپا تھا۔ اسی زمانے میں ان کے بعض عربی مضامین اور افسانوں کے ترجمے بھی شائع ہوئے تھے۔ لیکن بعد کو انھوں نے ”نگار“ اور ”معارف“ میں لکھنا شروع کر دیا، اور ”ادبی دنیا“ سے تعلق منقطع ہو گیا۔ ۱۹۳۶ء میں جب ان کی پہلی سنجیدہ تصنیف ”فلسفہ کلام غالب“ شائع ہوئی، تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کا مطالعہ کتنا وسیع ہے، اور انھیں کتنے آفرینی اور بات سے بات پیدا کرنے کا کیسا عکس حاصل ہے۔ اس کے مدتوں بعد ”اردو زبان کا ارتقا“ شائع ہوئی (دعا کا ۱۹۵۶ء)۔ یہ دراصل ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، جس میں انھوں نے اردو زبان کے آغاز اور اس پر دوسری زبانوں کے اثرات کی تاریخ بیان کی ہے۔ ان کی تین کتابیں سائنات سے متعلق ہیں: ”داستان زبان اردو“ (دلی ۱۹۶۱ء)، ”لسانی مسائل“، ”اردو سائنات“ آخر الذکر دونوں مضامین کے مجموعے ہیں۔ ”اردو سائنات“ پر انھیں ۱۹۶۶ء میں ”داتو ادبی انعام“ (پانچ ہزار روپے) دیا گیا تھا۔ ایک اور کتاب ”غالب: فکر و فن“ بھی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین جو مختلف جریدوں میں شائع ہوئے تھے، انھیں دو جلدوں ”معیارِ ادب“ (کراچی ۱۹۶۱ء) اور ”نئی پرانی قدریں“ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ہر ذہین مضمون تشریحاً حالت میں پڑھے ہیں۔

ان کا ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء صبح کے وقت کراچی میں انتقال ہوا، تدفین اسی شام علی علی

آئی۔ تاریخ ہوئی، " فراق شوکت سبزواری قبرستان العارفین میں دفن ہوئے۔

شوکت صاحب کی شادی ۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر سید مبارک علی کی بڑی صاحبزادی ہاجرہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ڈاکٹر مبارک علی رشتے میں ان کے اموں ہوتے تھے۔ یہ اس طرح کردہ شوکت صاحب کی والدہ (حلیمہ النساء بیگم) کے حقیقی اموں ڈاکٹر سید بنیاد علی کے بیٹے تھے (شوکت صاحب کی نانی کا نام بنیاد بیگم تھا) ڈاکٹر سید مبارک علی بھی اپنے والد ڈاکٹر سید بنیاد علی کی طرح سائنس تھے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے ہاپورڈ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں وطن کی اور اپنے خاندانی قبرستان (نزد میدان ہاپورڈ) میں دفن ہوئے۔

ہاجرہ بیگم کے بطن سے ان کے دو بیٹیاں (حمیدہ اور سبحانہ) اور تین بیٹے (عارف، اختر، اور راشد) ظہور و طاری الفور موجود ہیں۔ دونوں بچیوں کی شادی ہو چکی ہے، اور وہ اپنی اپنی عجم اُرام و آسائش کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ بڑے صاحبزادے عارف اختر انگلستان میں (غالباً ایک کارخانے میں میکینک) انجینیر کے عہدے پر کام کرتے ہیں۔ چھوٹے دونوں لڑکے پاکستان میں ہیں۔

شوکت صاحب نے اس بیگم کو اپنی ڈھائی کی ملازمت کے زمانے میں طلاق دے دی، اور اس کے بعد انھیں کی چھوٹی بہن سلطانہ بیگم سے نکاح کر لیا تھا؛ لیکن وہ آخر تک ہاجرہ بیگم کے بھی کفیل رہے (بلکہ وہ رہتی بھی اسی گھر میں تھیں)۔ دوسری بیگم کی اولاد کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر

۸ ستمبر ۱۹۱۹ء کو مراد آباد کے سربراہ اور مملو طسقی رشتہی خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کی ایک خاتون راجہ محمود آباد کے عقد نکاح میں آئیں، تو اس کے بعد کچھ لوگ اثنا عشری مسلک کے پیرو بن گئے۔ انھیں میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے دادا بھی تھے۔ انھوں نے مراد آباد کی سکونت ترک کر دی اور لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا۔

ذاکر حسین کے والد ذاکر حسین کا نکاح نواح بارہنگی (پروپی) ایم۔ عیسیٰ بشن پور کے شیخ ریاست علی خان کی بیٹی سے ہوا تھا۔ ذاکر حسین اپنے والدین کی اگلی اولاد تھے۔ ان کی ولادت اپنی نامتوالی بشن پور میں ہوئی، اور ان کی والدہ ان کی ولادت کے وقت انتقال کر گئی تھیں۔ ذاکر حسین نے ۱۹۲۴ء میں دسویں درجہ کی سند لینے کے بعد کریمپن کالج، لکھنؤ میں داخلہ لے لیا، اور سال بعد ۱۹۳۸ء میں یہاں سے بی اے کا امتحان پاس کیا، گھر کی مالی حالت کچھ بہت تسلی بخش نہیں تھی۔ تعلیم کا سارا زمانہ یوسف حسین صاحب پریسٹر لکھنؤ نے ان کی سرپرستی کی، بلکہ یہ انھیں کی کوششیں میں رہتے تھے اور انھوں نے ہر طرح ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی کی۔ ابھی کالج ہی میں تھے کہ والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ سٹی، شہید اختلاف کامدان بنا ہوا تھا۔ ایک طرف سے مدح صحابہ کے جلسے اور مجلس نکل رہے تھے، تو دوسری طرف سے ہڑائیوں کے۔ ذاکر حسین بہت اچھے مقرر تھے خوش لہجہ

اور خوش بیان۔ اگرچہ تبرا سے کوسوں دور تھے، لیکن بہر حال فیسی مجلسوں میں انہیں بھی خطاب کرنا پڑتا تھا۔ جب غریبین کی سرگرمیوں کے باعث شہر میں غصہ اس کا خطرہ پیدا ہو گیا، تو حکومت، مداخلت پر مجبور ہو گئی، متعدد حضرات کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو گئے، انہیں میں ذاکر حسین بھی تھے۔ کسی نے بد وقت انہیں شہرہ کر دیا۔ یہ گھبرا کر بھاگ نکلے، اور کبھی پہنچ کر دم لیا۔ اس کے بعد کبھی میں مستقل حکومت اختیار کر لی۔

اس تحریک اور ذاکر حسین کی اس میں شرکت کا ان کے لیے ذاتی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے نام کے ساتھ فاروقی لکھنے لگے۔ اگرچہ ان کا خاندان فاروقی تھا، لیکن شیعیت اختیار کرنے کے بعد غریبیتا سب لے یہ نسبت لکھنا ترک کر دی تھی۔ ذاکر حسین صاحب نے اس کی تجدید کی۔

بہٹی میں سب سے پہلی ملازمت انجیل یگ محمد ہائی اسکول میں پڑھانے کی ملی۔ مشاہرہ قلیل اور حوصلے بلند، کب تک یہاں پڑے رہتے ابا سے کچھ مدت بعد ڈیوڈ ماسون ہائی اسکول میں جگہ ملی گئی، اور تنخواہ بھی دیا دہ لی۔ اس اسکول میں بہت دن رہے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

ذاکر حسین بیٹی کا پوریشن کے انتخاب میں کھڑے ہوئے خود مسلمانوں نے ان کی مخالفت کی۔ وجہ؟ یہ یہودیوں کے اسکول میں ملازم ہیں۔ نتیجہ؟ یہ انتخاب ہار گئے اور ان کا مخالف جیت گیا۔

بہر حال انتخاب میں ہار جانے کی وجہ سے ان کی ملازمت ہر کوئی آپہنچ نہیں آئی اور بظاہر وہ جب تک چاہتے، اس اسکول میں رہ سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی واقع ہے کہ ان کا محض بی، اے ہونا (اور ایم اے نہ ہونا) ان کی ترقی کے رستے میں مسائل ہو رہا تھا۔ اس پر انہوں نے ۱۹۶۴ء میں پرائیوٹ طور پر ایم اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس کے بعد وہ ہمارا سٹرک کالج آف آرٹس مائنس، بہٹی میں اردو، فارسی اور اسلامیات پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ اب انہوں نے مشہور مرثیہ گو

شاعر میرزا سلامت علی دہر کے حالات اور ان کے شاگردوں کے سلسلے میں مواد جمع کیا اور ایک مبسوط مقالہ لکھ کر بمبئی یونیورسٹی میں پیش کر دیا، جس پر انھیں ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹراف نلا سفی (پی ایچ ڈی) کی سند ملی۔ یہ واقع مقالہ ”دہستانِ میر“ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ (لکھنؤ ۱۹۶۶ء)

۱۹۶۶ء میں افریقا ٹیوٹنڈریشن کے سابق صدر الحاج ابراہیم حسین شریف، ونوچی نے ان سے فرمائش کی کہ آپ افریقا آئیں، اور ہمیں وہاں کے خیمیں مدارس کے لیے دینی نصاب مرتب کرنے میں مدد دیں۔ اس پر وہ چند ماہ کے لیے افریقا گئے اور یہ نصاب تیار کر دیا۔ یہ اردو اور گجراتی دونوں زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ الحاج ابراہیم حسین شریف اور افریقا کے بعض اداروں نے ان کی جو خدمت کی تھی، اس سے ان کی مالی حالت بہت کچھ سہج ہو گئی، اور انھیں ہن کے بعد کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اپنی وفات سے پہلے وہ ڈاکٹراف لٹریچر ڈیٹام کی سند کے لیے تفائد سے متعلق ایک مقالہ قلمبند کرنے میں مصروف تھے۔ اس میں تعصیصے کی تاریخ، اور عربی فارسی اور عربی اردو میں تعصیصے کے ارتقا پر نظر ڈالنے کا ارادہ تھا۔ ہنوز اس کام سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ ۲۴ مارچ ۱۹۷۳ء کی شب میں ڈھائی بجے (یعنی ۲۵ مارچ علی الصبح) اخلاقی حقیقی کے حضور پہنچ گئے۔ جنازہ ۲۵ مارچ ہی کو دن کے دس بجے اٹھا اور انھیں خیموں کے مرکزی قبرستان ”رحمت آباد“ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

۱۹۴۵ء میں سردار حسن کے سب سے چھوٹے بھائی مسید شیر حسن قلیل کی صاحبزادی حورجہان (عرف نرہان بیگم) سے شادی ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹے اور چار بیٹیاں ہوئیں۔

انھوں نے تعصیص و تالیف کا مشغلہ اپنے قیام لکھنؤ کے زمانے ہی میں اختیار کر لیا تھا۔ ان کا معقول مشابہ تھا کہ مولانا مجتبیٰ حسن کا نوپوری (صدر شعبہ

دنیا تہ شیعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے لکھنؤ میں خبیثہ سوسائٹی قائم کی۔ فاروقی صاحب نے ان کی فرمائش پر دینی موضوعات کے بارے میں کئی رسالے لکھے، اس سوسائٹی کی طرف سے شائع ہونے لگے۔ لکھنؤ میں ان کا متعدد اخباروں اور رسائل سے بھی تعلق رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے سید خیر حسن قتیل کے مشہور ہفتہ وار "قتیل" میں بھی کام کیا۔ بمبئی میں بھی یہ صحافتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ یہاں انھوں نے مسلم اسٹوڈنٹ لیڈریشن میں بھی دلچسپی لینا شروع کی اور اس کے ہفتہ وار پرچے "پرداز" میں باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ ان کے علاوہ دو روزانہ اخباروں "انقلاب" اور "ہندوستان" سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا۔ ان میں ان کے مفاد میں بگڑاوارے تک شائع ہوتے تھے۔ ان کی مطبوعہ تصانیف میں "سندریۃ ذیل" قابل ذکر ہیں۔

ادب لطیف (اردو ادب کی مختصر تاریخ)؛ دبستان آرزو (آرزو لکھنؤ کے حالات)؛ سیاب اکبر آبادی؛ سیر شکوہ آبادی؛ دبستان دیرا (خشیہ سنیہ حضرت علی اکبر کے سوانح)؛ شمس بجاہ ازبانی حکومت پنج سہیں؛ جمہوریت اور اسلام؛ مسلم یگ کیوں؟

گہر گورکھپوری، ایشوری پرشاد

مشرقی ہونے میں گورکھپور کئی لحاظ سے اہم شہر ہے۔ اگرچہ جہاں اردو ادب سے دلچسپی لینے والے شروع سے رہے، لیکن ریاض خیر آبادی کے ۱۸۸۱ء میں ورد کے بعد شہر کی فضا شعر و شاعری کے لیے بہت سازگار ہو گئی۔ کائستھ حضرات، اسلامی دور حکومت کے شروع ہی سے، اردو و اور فارسی میں پیش پیش تھے، ان کی گورکھپور اور اس کے نواح میں بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ وہ بھی علم و ادب کے اس ماحول میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ گورکھپور کے شعرا میں اچھی خاصی تعداد کائستھ حضرات کی ہے۔

ان میں ایک صاحب حیثیت بزرگ فنشی براگ دت سرلو اسٹو تھے۔ ان کی وسیع جاداد اور زمین داری تھی۔ انہیں کے بیٹے فنشی سنگھ پرشاد عرف بھٹی لال، گہر کے والد تھے۔ گہر پانچ بھائی تھے، ایک بھائی ان سے بڑا تھا اور تین چھوٹے۔ گہر ۱۹۱۱ء میں اپنے جدی مکان محلہ قاضی پور خرد، گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر مایا صاحب خاریج، سلامیہ اسکول میں داخلہ لیا، جواب انٹر کالج کے درجے کو پانچ چکا ہے، لیکن تعلیم

سے گورکھپور میں ایک خاصا بڑا امام ہاتھ ہے، اور اس کے بچے ایک وقف ہے۔ اسے نواب آصف اللہ نے تعمیر کرایا، اور اس دور کے ایک صاحب دل درویش روشن علی شاہ کو اس کو سنو فی مقرر کیا تھا۔ ان کے بعد سب بھتی احترام مایا صاحب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مونسو روتولی ایمان جواہر شاہ نے اسکول کے بچے زمین وقف کا تو اسکول کے نام میں تیار ہوئے کے

جاری نہ رہ سکی۔ آٹھویں درجے میں ناکام رہنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ چونکہ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، اس لیے کسی نے اس کی پروا بھی نہ کی۔ انھوں نے البتہ اپنے طور پر اردو، فارسی کا مطالعہ جاری رکھا اور رفتہ رفتہ خاص استعداد پیدا کر لی۔

۱۹۳۰ء میں شعر گوئی کا آغاز ہوا، تو اس میں خاص علی جلال لکھنوی (ف ستمبر ۱۹۰۹ء) کے شاگرد عبدالحمید فہیم گورکھپوری (ف ۱۹۳۲ء) سے مشورہ کرنے لگے۔ بیلکری کا زمانہ، شعر و شباب اس پر مستزاد، اس نے انھیں کوہِ صن میں پہنچا دیا، اور وہی سہی کمر شراب نوشی نے پوری کر دی۔ ساری عمر خجڑہ میں بسر ہوئی۔

جہاں یہ اطوار ہوں، وہاں قارون کی دولت بھی کفالت نہیں کر سکتی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بزرگوں سے جو کچھ درختے میں لاس تھا، وہ جلد ہی ٹھکانے لگ گیا اور کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ بے والوں نے جب یہ حالت دیکھی، تو انھیں چرانے لگے۔ صحت بھی روز بروز گرنے لگی۔ ۱۹۴۶ء میں فالج کا حملہ ہوا۔ علاج مطالبے سے بچ تو گئے، لیکن اس کے بعد پوری صحت ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ جبراً جو کثرتِ شراب نوشی سے تباہ ہو چکا تھا، جو اب دینے لگا۔ بہت بیمار ہو گئے چند دن کس پرسی کے عالم میں گزرے۔ دوستوں کو خبر ملی، تو انھوں نے ڈسٹرکٹ اسپتال میں پہنچا دیا۔ وہیں ۱۵ جون ۱۹۷۳ء شام کے پانچ بجے، جان بحق ہو گئے۔ ارٹھی اگلے دن (۶ جون) قبل دوپہر نکلی، اور دریائے راہتی کے کنارے راج گھاٹ پر اسے تدفین کر دیا گیا۔

اگرچہ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن ہے یہ کہ وہ غزل کے شاعر تھے۔ دیوانِ اردو ”سلکِ گہڑی“ ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا۔ (گورکھپوری ۱۹۶۹ء) ”سلکِ گہڑی“ کا کچھ منتخب کلام دیوناگری رسم الخط میں ”مالا“ کے عنوان سے بھی شائع ہوا ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں کوئی غلطی نہیں۔ فرمان

اور فن کے پہلو سے بھی اس میں کوئی مستقیم نہیں ہے، لیکن کوئی جذبۂ خاص بات بھی نہیں؛ وہی روایتی اندازِ جوازلی سے ہمارے شعر کا طرزِ امتیاز رہا ہے، ان کے ہاں بھی یہ ہے۔

نور نے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

دردِ دل کی بیکزاری کچھ نہ بول سچ	جس نے بھی دکھا مجھے، گھبرا گیا
اس لگاؤ ناز کو جسے تھے ہم سالانہ زیت	اس نے تو شیرازۂ ہستی پریشاں کر دیا
ہاے، چاہا ہر کچھ، کیا اس نے	کچھ بھی میرا، گھبرا کیا نہ ہوا
جس قدر سنتے غم، وہ داستانِ غم، گھبرا	دل مرا اتنا ہی مشتاقِ بیاں بنتا گیا
یوں آئیے میں رنگِ جنوں دیکھتے رہے	جیسے کہل رہے ہیں کسی اجنبی سے ہم
ملتی نہ تھی دنیا میں کہیں راحتِ ہستی	بیخانے میں پیچھے ہیں، تو فہم بھول گئے ہیں
جی کے بہلائے کو اکثر لپا لپا کرتے ہیں ہم	کیا خبر تھی، سے ہماری زندگی ہو جائیگی
کیا جانے، کیا ملیں گا تری بارگاہ سے	ہم کو غیبِ الٰہی تنگیِ داماں ابھی سے ہے

حشر سیتا پوری، سید محمد کاظم

سیتا پور کے محکمہ قضیہ بارہ کے قاضی سید محمد مسکری کے صاحبزادے تھے، جو ساری عمر سرکاری ملازم رہے اور سب جہزاد کے عہدے سے پیشین پر سبکدوش ہوئے۔ ان کا خاندان سادات رضوی سے تھا اور وہ حضرت امام رضا کی نسل سے تھے، لیکن کسر نفس کا یہ عالم تھا کہ کبھی اپنے نام کے ساتھ رضوی کی نسبت نہیں لکھی۔

حشر صاحب تین بھائی تھے۔ سب سے بڑے سید محمد طاہر (انجنیئر) دیوانی کے مشہور وکیل تھے، درقوں سیتا پور بار ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ چھوٹے قاضی سید محمد تقی مانتف سیتا پوری تھے۔ (ف ۶۱۹۷۱)

حشر ۱۸۹۷ء میں سیتا پور میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق بنی تعلیم کے بعد، جو قرآن شریف اور اردو فارسی پر مشتمل تھی، سیتا پور کے سرکاری اسکول میں بھیج دیے گئے۔ دسویں کی سند لینے کے بعد لکھنؤ کے قدیمی کالج میں داخلہ لیا، اور یہاں سے بی اے پاس کیا۔

اس زمانے میں ریاست محمود آباد کی علم دوستی کی شہرت تھی۔ ایبٹ آبادی محمد خان والی محمود آباد خود بھی شعر کہتے تھے، سحر شعلہ تھا۔ وہ شاعروں اور ادیبوں کے قدردان تھے۔ چنانچہ لکھنؤ کے کئی شاعر مثلاً عزیز لکھنوی، ظریف لکھنوی،

بہت دن بعد خان بہادر مسعود حسن مسعود نے ان کی تادیکہ ولادت نہیں،

بافضل کردگار خدہ حشر در وجود

سالی ولادتش دل مسودت است

بنیم کرد و بہار جہاں نستوی شگفت

ایں سالی بیسوی است کہ بخت جہاں شگفت

(۱۸۹۵ء)

ثاقب لکھنؤی وغیرہ ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی حشر کو کالون کالج، محمود آباد میں ملازمت مل گئی۔ اگرچہ شروع اس سے پہلے ہی کہنے لگے تھے، لیکن دراصل ان کے ذوقِ سخن کی ترسیت محمود آباد کے قیام، اور ان اساتذہ وقت کی صحبت کی، رہن برکت ہے۔ لیکن خود انہوں نے اپنے کلام براجمد حسین (عرف المدد میاں) ہاتف سینا پوری (ف ۹ جولائی ۱۹۲۷ء) سے اصلاح لی۔

جب راجہ سر محمد علی محمد خان مرحوم کو ان کے بارے میں علم ہوا، تو انہوں نے انہیں کالج سے بلوا کر تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ان کی وفات (جولائی ۱۹۲۷ء) کے بعد ان کے صاحبزادے راجہ محمد امیر احمد خان (ف ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء) کے عہد میں بھی یہ ریاست کے ملازم رہے۔ ۱۹۵۲ء میں زمینداری کا خاتمہ ہوا، تو حشر صاحب محمود آباد کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ کے ایک فوجی دفتر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن یہاں بھی نہ سکی، اور مستعفی ہو کر سینا پور چلے آئے؛ اس کے بعد پھر کیں باہر نہیں گئے۔

اپنی طویل عمر میں بہت کچھ کہا، فوج، اسلام، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، غزل۔ غرض کس میدان میں بند نہیں تھے۔ بلکہ بعض تاریخی ڈرامے بھی لکھے، انیسویں، مجموعہ کلام آج تک شائع نہیں ہو سکا؛ اور اب اس کے شائع ہونے کا امکان بھی کیا رہ گیا ہے!

طویل علالت کے بعد ۱۹۷۳ء جون کو، خستہ سفر باندھا اور اپنے خالق کے پاس حاضر ہو گئے۔ سینا پور ریلوے اسٹیشن کے قریب کربلا سے سلیم پور میں دفن ہوئے۔

اولاد جسمانی ہیں مین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں ہیں۔ بیمنی لڑکے برسرِ روزگار ہیں اڑسے گورکھ پور یونیورسٹی میں ملازم ہیں۔

بہت مشکل سے چند شعر جناب دس سینا پوری کی وساطت سے ملے ہیں، وہی حاضر ہیں،

خشبِ فم آنکھوں میں کٹ جاتی ہے تم نہ آتے ہو، زمیند آتی ہے
 بخور کے ذکر پہ قم کیوں بجھوے! بات دنیا کی بھی جاتی ہے
 حُسن کی آنکھوں میں آنسو بھرائے عشق کی بات رہی جاتی ہے
 مرے مئے کے تھے سب دردِ عظم کیا! ستم بجا داب ترکِ بستم کیا!
 شعا حسن ہے شہرت پسندی محبت کا کوئی رکھے بھرم کیا!
 ایک آدا میں سو سونا ز حُسن ہے کتنا عشق نواز
 مجد کو سلسلِ تیری تلاش عشق کا ایک انجام آغواز

کوئی میخوار اس محفل سے پیا سا جا نہیں سکتا

ہیشہ سے غم بہتی لاگردشیں ہیں ہے پیمانہ

دغور غم میں بھی ہر لطفِ زندگی پیدا صلاحیت تو کرے خود میں آدمی پیدا
 بڑے خسے سے گذر جائیگی فراق کی رات ترے خیال سے کر لی ہے دوستی پیدا
 خضر کتر کے نکل جاتے ہیں راقِ عشق سے ایک مدت ہو چکی ہے الٰہ کو دنیا دیکھتے

ترا را دراز نہ رہ سکا، کسی طرح پروردگار میں

وہ حقیقتوں کی تجلیاں نظر آئیں مجھ کو مجاز میں

اشکِ ہشیم خونِ فشاں کو کب کر دوں؟ عشق کے اس رازِ دروں کو کیا کر دوں!
 طے ہمد ہے میں عشق کے پیرِ بیچ راستے منزل پہ رفتہ رفتہ ہلا جا رہا ہوں میں
 کیا حکم کا ترے انداز ہے ذرہ ذرہ گوشِ بر آواز ہے
 یہ عالم ہوا دل کا ضبطِ فشاں سے کہ حرفِ طلب بھی نہ نکلا زباں سے

اسے جس طرح چاہے دیش دیش کے سلیے مرادِ کوسیری زبانی نہیں ہے
 دم ہے سکا لبوں پہ ترے انتظار میں پھر آخیالِ دوست کہ ٹھہرا ہوا ہوں میں
 عشق سے قبل مجھ کو عطا دل ہوا درد سے پہلے دردِ آشنا مل گیا

بلے معرفت بھی امرا حُسنِ یقیں تو دیکھ

ہمدہ پہ کر رہا ہوں میں ہمدہ ترے بغیر

دل کا کیا اعتبار الفت میں ! آج ایسا ہے کل پر ایسا ہے
 کچھ ایسا فرق تو ہستی و نیستی میں نہیں حیات و موت کی حد آدمی کا اک دم ہے
 نغمہ وحدت کا ہم آہنگ کتنا سادہ ہے سیکڑوں پردے میں لیکن ایک ہی آواز ہے
 ہم کو یقین ترک عشق فصول اپنا اچھا برا سمجھتے ہیں
 لہذا سب کچھ اٹا ہوں میں تمہیں تم کو بھی تو کچھ سمجھنا چاہیے
 ایک سوہ دن تھا کہ میں راہ پر منزل تھا اب غبار و منزل بے جاتا ہے مجھے
 حسن کی ہر بات کا اس کو یقین عشق سادہ کھانہ میں نے سادہ دل
 عزت نفس جس میں ہو رہا ر محشر اس دوسنی سے ڈرتا ہوں
 حسن کی دنیا میں کمال عشق کی دنیا میں یقین
 کیا قیامت کر گئی محشر میں وہ نبی نظر
 ہم نے خود کو کہہ کیا، اور خود پشماں ہو گئے

جعفر حسن (جافرسن)، ڈاکٹر

کون ہے حسن نے سرسید کے بار بار اور دست راست نواب حسن الملک کا نام نہیں سنا ہوگا! ان کا نام مہدی علی تھا اور وہ اٹا روہ کے رہنے والے تھے۔ وہ متوسط طبقے کے فرد تھے، لیکن ان کی قابلیت اور محنت، دیانت داری اور معاملہ فہمی اور فرض شناسی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب سس تعلیم ختم کرنے کے بعد انھوں نے ملازمت شروع کی ہے، تو صرف دس روپے مشاہرے پر (مقرر) بھرتی ہوئے تھے۔ اور جب ملازمت ختم کی اور پنشن پر سبکدوش ہوئے، تو اس وقت ان کا مشاہرہ دو ہزار روپے تھا اور پانچ پنشن ۸۰۰ روپے (حالی) مقرر ہوئی۔ وہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۷ کو شیلے میں برابری ملک بقا ہوئے۔ لاش ملی گڈھ لائی گئی اور سرسید کے پہلو میں سپرد خاک ہوئی۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

مہدی علی جب ملازم ہر کر حیدر آباد (دکن) آگئے، تو انھوں نے اپنے خاندان کے ہر اس شخص کو وہاں ملازمت دلوائی، جو حیدر آباد جانے پر تیار تھے۔ انہیں میں ان کے چھوٹے بھائی امیر حسن بھی تھے۔ امیر حسن رفتہ رفتہ اول تعلقات کے مہدے تک پہنچے اور انھوں نے اسی مہدے سے ۱۹۱۴ء میں پنشن پائی۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے:

بہت دن کی بات ہے، جب میں نے 'میات مہدی' معتمد امین زہری میں خاندان کا حال پڑھا، تو دیکھا کہ معمول کے خلاف اس میں شجرے کا کوئی اندراج نہیں ہے، حال آں کہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ ان کا خاندان سید تھا۔ اس پر میں نے مہدی علی

احسن الملک کے بھتیجے (ڈاکٹر جعفر حسن) اجازت سے دریافت کیا کہ زرا اپنے خاندان کے ہندوستان آنے کی تاریخ پر کچھ روشنی ڈالے اور بتائے کہ حضرت علی ہنگ کتنی پشتیں ہیں۔ اس پر انہوں نے سرے سے اپنے خاندان کے سید ہونے کی تخیل کی اور لکھا:

ہم لوگ سید نہیں معلوم نہیں، کس نے اپنی شیخت جتانے کو سیادت کا دعویٰ کیا۔ اسی لیے نہ کہیں میں نے، نہ ادا دی حسن اور عابد حسن سفرانی نے اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ لکھا۔

نواب حسن الملک کا خاندان عقیدے کے لحاظ سے مخلوط تھا، ایک بھائی سستی، تو دوسرا شیعی۔ سستی مردوں کی شادی فیعی عورتوں سے، اور شیعی مردوں کی شادی سستی عورتوں سے، ان کے ہاں کا حام دستور تھا۔ نواب حسن الملک جب سستی ہو گئے، تو انہوں نے اہل سنت کی تائید اور تظہیر کے رد میں اپنی مشہور کتاب "آیات یتنات" لکھی، ۱۳۵۷ھ ہجری کے چھوٹے بھائی امیر حسن فیعی تھے۔ انہوں نے "آیات یتنات" کے جواب میں "آیات حکمات" تصنیف کی، لیکن دونوں کے درمیان تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔

امیر حسن مجلس کرتے اور مرثیہ بھی پڑھتے تھے۔ انہیں تحت لفظ پڑھنے میں خاص لکھ حاصل تھا۔ ہر سال محرم میں عین چار اور صفیں دو بڑی مجلسیں ان کا معمول تھا، اور ان میں خود بھی شرکت فرماتے تھے۔ وحید کافر تھے جس کی ایک ٹیپ کا شعر ہے:

جان یوں تن سے مرے اے شہر خوشنویس
جس طرح وقت کو بھول سے خوشبو نکلتی

انہیں بہت پسند تھا، اور دوسرے تیسرے برس وہ یہ مرثیہ فرود پڑھتے تھے، ۱۹۳۷ء جون ۶ کو حیدر آباد میں رحلت کی اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔ امیر حسن صاحب کی اولاد فریسنہ میں چھو بیٹے تھے، اہدی حسن، بدر الحسن، جعفر حسن، ادا دی حسن، ضیاء الحسن، عابد حسن۔ بدر الحسن کا اپنے زمانے میں

حیدر آباد کے آزاد خیال اور جمہوری تحریک کے لیڈروں میں شمار ہوتا تھا۔ انیسویں ان کا جین عالم مشاب میں انتقال ہو گیا۔ ہادی حسن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی کے کامیاب پروفیسر رہے، بہت اچھے معزز تھے، اور متعدد کتابوں کے مصنف بھی۔ ان کا سن ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوا۔ عابد حسن (سفرانی) دہری جنگ عظیم کے دوران میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی ہندوستانی فوج میں رہے اور آزادی وطن کے بعد وزارت خارجہ میں لے لیے گئے تھے۔ وہ مختلف ممالک میں ہندوستان کے سفیر رہنے کے بعد اپریل ۱۹۶۹ء میں ملازمت سے پینشن پر سبکدوش ہوئے، آج کل حیدر آباد میں قیام ہے، عیاد احسن کا بہت کم عمری میں انتقال ہو گیا۔

جعفر حسن ۱۲ اگست ۱۹۰۴ء کو برہمنی میں پیدا ہوئے، جہاں ان دنوں ان کے والد امیر حسن صاحب اول تعلقہ اس کے عہدے پر فائز تھے۔ والد کے تباہی کے ساتھ یہ بھی مختلف مشہروں میں گھومتے رہے۔ چنانچہ ان کا بچپن راجپور، ملگر، پٹن جرو، نامد شرو وغیرہ میں بسر ہوا۔ ان کے والد کے ہاں بچوں کی انگریزی تعلیم کے لیے ایک انشکو انڈین خاتون (سنز بوٹمن) مستقل ملازم تھیں۔ وہ فخر ہی میں رہتی تھیں اور جہاں کہیں امیر حسن صاحب کا تبادلوں ہوتا، وہ بھی ساتھ جاتیں۔ اردو، فارسی، ریاضی، ناظرہ قرآن وغیرہ پڑھانے کے لیے، جہاں جلتے وہاں کسی مقامی مولوی کا اختتام کر لیا جاتا۔ جعفر حسن صاحب کی تعلیم بھی اسی منہج پر ہوئی۔ جب دس برس کے ہوئے، تو انھیں ۱۹۱۴ء میں مدرسہ عالیہ، حیدر آباد میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں دسویں درجے کی سند حاصل کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی نئی نئی قائم ہوئی تھی حیدر آباد کے امرا کا طبقہ اسے کسی

بے نیل تذکرہ حیدر آباد کے مشہور میر عہدت ستر ابرک نمبر ۱۱ سنز بوٹمن کے بھانجے ہیں۔ حیدر آباد کی بعض عایشہ و مقابلی وید عمارتوں کے نقشے انھیں نے تیار کیے تھے۔ وہ کمال انگلستان میں مقیم ہیں۔

تھوڑی مدت کی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسے گنتیا درجے کی درسگاہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب جعفر حسن نے یہاں داخلہ لیا، تو خاندان کے بعض لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی؛ اور اس وقت تک دم نہیں لیا، جب دو سال بعد انھیں یورپ نہیں بھیج دیا گیا۔

نومبر ۱۹۳۲ء میں وہ جرمنی گئے؛ وہاں پانچ برس مہرے۔ اس دوران میں انھوں نے ۱۹۳۵ء میں برلن یونیورسٹی سے جرمن زبان اور ادبیات کا ڈیپلوما حاصل کیا اور دو سال بعد ۱۹۳۷ء میں جرمنی کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہائیڈل برگ سے سماجیات (سوشیالوجی) اور معاشیات (اکنامکس) میں ڈاکٹریٹ (ڈی فیل) کی سند لی۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: ہندوستان کا افلاس۔ یہ مقالہ انھوں نے جرمن زبان میں لکھا تھا اور یہ اسی زمانے میں چھپ گیا تھا (ہائیڈل برگ ۱۹۳۱ء)

ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ سب سے پہلے ۱۹۳۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی میں جرمن کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی وہ طلبہ کو معاشیات اور سماجیات کا درس بھی دیتے تھے۔ دو سال بعد (۱۹۴۰ء) وہ جرمن اور سماجیات کے شعبے میں ریڈر بن گئے۔ ان ایام میں یہاں سماجیات کا شعبہ الگ نہیں تھا؛ یہ انھیں کی کوششوں سے ۱۹۴۵ء میں نکلا اور وہ صدر شعبہ مقرر ہوئے ۱۹۴۸ء میں ترقی ہوئی اور وہ پروفیسر بنا دیے گئے۔ ان کا ۳۳ برس تک عثمانیہ یونیورسٹی سے تعلق رہا۔ اور ۱۹۶۱ء میں یہاں سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اُردو سے ان کی دلچسپی طابعی کے زمانے کی دیرین تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے تعلیمی زمانے میں وحید الدین سلیم پانی پتی (دف ۱۹۳۸ء) ان کے اردو کے استاد تھے۔ سلیم کی مدرسین قابلیت اور علمی ذہانت اور حدت طرازی کے سب معترف ہیں۔ ان کی وضع اصطلاحات ”جواب کلاسیکی حیثیت اختیار کر چکی ہے، ایک مجدد آفریں

تعلیم تھی۔ ایاس برنی (۱ جنوری ۱۹۵۹ء) جعفر حسن کے معاشیات کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنی دو کتابوں ”علم للمعیشہ“ اور ”معوشت الہند“ کے باعث بہت مشہرت حاصل کی۔ وہ ”ہندوستانی مالیات“ کے موضوع پر بھی ایک کتاب لکھ رہے تھے، لیکن ابھی یہ مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ادبیات کی طرف پھسل گئے اور اردو نظم کے انتخابات شائع کر لے گئے۔ چنانچہ انہوں نے ”ہدایاتِ فطرت“ کے عنوان سے غالباً بارہ جلدیں شائع کی تھیں۔ لیکن وہ ادبیات ہی پر تانیع نہ رہ سکے۔ اور آگے نکل گئے، تو مناظرِ انداز کی مذہبیات تک پہنچ گئے۔ عرض انہوں نے اپنا اصلی میدان (معاشیات اور مالیات) چھوڑ کر بہت وقت ضائع کیا اور اس سے اردو کا بہت نقصان ہوا۔ اگر وہ معاشیات اور مالیات ہی کے لیے وقف رہتے، تو خیال کیجیے کہ ان کی بدولت آج اردو کا دامن کتنا مالا مال ہوتا۔

ڈاکٹر عبد الستار مدنی بھی اس زمانے میں ہیں تھے (۱ جولائی ۱۹۷۷ء) وہاں کا اردو سے عشق اور مالیات سے شغف کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ عرض ایسے اساتذہ کی صحبت اور رہبری سے جعفر حسن کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔ اردو انہوں نے گھر پر پڑوسی تھی۔ ”پھول“ (ہفتہ وار) گھر پر آتا تھا اور ان کے مطالعے میں رہا تھا۔ ان اصحاب کے میل جول نے سونے میں سہاگے کا کام کیا اور انہیں اردو دیکھنے کی ترغیب ہوئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو نورِ تعلیم تھی۔ ڈاکٹر جعفر حسن یہاں استاد و مقرر ہوئے، تو وہ کبھی سماجیات کا سا جدید معنوں اردو میں پڑ جانے پر مجبور تھے یہاں نئی نئی اصطلاحوں سے واسطہ پڑا، جن کے لیے اردو میں کوئی مترادف موجود نہیں تھا، یہ انہوں نے اپنی ادراج اور زبان سے وضع کرنا شروع کیں۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہمیں فارسی اور عربی کے بجائے ان اصطلاحات کی بنیاد مہندی اور سذکرت پر رکھنا چاہیے، جو اردو کے خاندان کی زبانیں ہیں۔ ضمناً یہاں یہ

بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر جعفر حسن کی والدہ ماجدہ (فخرالحاجہ بیہم) ایرانی شرافتیں، اس بے فانی نگرانی کی اور کی زبان تھی۔ پھر یہی ہے کہ وہ مرہٹو اثر و دیرپائی میں پیدا ہوئے، اور چونکہ ان کی زندگی کے ابتدائی ۴۰ سال وہیں گزرے، اس لیے وہ مرہٹی اور ہندی پہلے ہی جانتے تھے۔ لیکن اب ملازمت کے بعد انہوں نے ہندی کا قارئین مطالعہ کیا اور اس سے انہیں واقعی بہت فائدہ ہوا۔ درؤحانی سال کی محنت اور مطالعے سے ہندی میں اتنی اچھی مہارت ہوئی کہ ۱۹۳۱ء میں انہوں نے ہندی شاعری پر منتخبات ہندی کلام کے عنوان سے اپنی پہلی کتاب شائع کی۔ اس میں بکیر، جمسی، رحیم، میرا بائی وغیرہ کے دوہے دے کر سماجی نقطہ نظر سے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۱۹۴۲ء میں ہانگ کانگ (ف جنوری ۱۹۴۸ء) نے ہندوستانی پر چار سبھا قائم کی، تو ڈاکٹر جعفر حسن بھی اس کے ممبر بن گئے۔ ۱۹۴۵ء میں سبھا کی کئی ہندو کانفرنسوں اور دعا میں منعقد ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس میں شریک ہوئے اور یہاں انہوں نے ایک خصوصی نشست میں اپنا مقالہ ”ہندوستانی پر چار کے طریقے“ پڑھا۔ گاندھی جی نے یہ مقالہ دیکھا، تو وہ اس سے آنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو سبھا کی اکاؤنٹ کمیٹی کا رکن مقرر کر دیا اور چندے بعد سبھا کی سالانہ میں لے لیا: اس کے صدور وہ خود تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو مختلف کمیشنوں سے گاندھی جی سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کے کئی مواقع پیش آئے۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے، گاندھی جی اردو ہندی کا مہکڑا غم کرنے کے لیے ہندوستانی کا جن ضروری خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جعفر حسن بھی ان کے مؤید تھے۔ انیسویں کہ گاندھی جی کی اچانک اور افسوسناک موت نے انہیں اپنا کام مکمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ لیکن ڈاکٹر جعفر حسن آخر تک انہیں اسوں کا پرچار کرتے رہے۔

ڈاکٹر جعفر حسن اردو اٹالی میں بھی اصلاح کے زبردست حامیوں میں سے تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ ہم میں طرح برتنے ہیں، اسی طرح لکھیں، اور جن حرف کی خاص آوازیں ہم ہندوستانی اور کرنے سے قاصر ہیں، انہیں اپنے حرف فونیتی کی نہرست سے نکال دیں (مثلاً ج، ڈ، م، بن، ط، ظ، ع) اسی اصول کے تحت وہ ہمیشہ اپنا نام جعفر حسن کی جگہ "جافرسن" لکھتے اور اسی طرح دستخط کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں دائرہ سدولہ کا رواج بھی ترک کر دیا تھا، اور مختلف قد، مثل، نشاء وغیرہ لکھتے تھے۔ اسی طرح "ٹ" اور "ص" کی جگہ صرف "س" لکھتے تھے۔ مثلاً اساسہ، سرورف۔ بلکہ اگر کوئی ان کی مانتا، تو وہ اردو کے بے لائینی رسم الخط اختیار کر لینے کے خواہشمند تھے۔

گاندھی جی کا قیام اور مؤید جو نے کاریل، اور۔ افریہ ہوا کہ وہ بچے قوم پرست بن گئے، بلکہ سچا توریہ ہے کہ وہ پان الاقوامی اور عالمی برادری کے نظر پتے کے علمبردار تھے، بروہ آخر تک کھتر کا پان اور گاندھی ٹوپی استعمال کرتے رہے۔ زندگی سہر شاہی کا کھڑاگ پالا ہی نہیں۔ نے غم و زد و نے ظم کا لا۔

انہوں نے بہت کچھ لکھا۔ مطبوعہ کتابوں میں عمرانیات اور مسئلہ تعلیم۔ ہماری ریلیں اور طرحیں، زرعی افلاس، ہند، سماجیات، امجد آباد ۱۹۳۸ء، ابتدائی عمرانیات (امجد آباد ۱۹۴۹ء، اطلاقی سماجیات (علی گڑھ ۱۹۵۲ء)، ہندوستانی سماجیات (علی گڑھ ۱۹۵۵ء) زیادہ مشہور ہوئیں۔

کئی غیر مطبوعہ کتابوں کے منکلی مسودے موجود ہیں، مثلاً (۱) سماجیات کی انگریزی، اردو مراد ثانی لغت (اس میں کوئی دس ہزار انگریزی لفظوں اور اصطلاحوں کے ہم معنی لفظ۔ بیشتر اپنے وضع کردہ۔ دے ہیں۔ اور پھر ایک آدھ لفظ کے اس کی تشریح کی ہے) ۲) ہندیاتی اصطلاحوں کی تشریحی لغت (اس میں تقریباً دو ہزار انگریزی کی دمن کا ج، راج، سماج، نفسیات وغیرہ اصطلاحوں کے لیے اردو اصطلاحیں وضع کی ہیں) ۳) انگریزی۔ ہندوستانی لغت (۴) سماجیات کے اصول۔ ان کے علاوہ کئی انگریزی کی مشہور تحریروں کے ترجمے غیر مطبوعہ گئے۔

ان کے شعری پس منظر کا ثمرہ دو کتابیں ہیں: "کارنامہ انیس" اور "غائب اور انیس"; ایک تقابلی مقابلہ یہ بھی شائع نہ ہو سکیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسن کو انیس سے بہت دلچسپی تھی اور وہ تحت تحت لفظ مرثیہ خوب پڑھتے تھے۔ آخری زمانے میں وہ ایک "انیس کہیں" قائم کرنے کے بہت متشغیل تھے، لیکن انیس کہ لوگوں کی سرد مہری کے باعث یہ جیل منڈ سے نہ بڑھ سکی۔

بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہو گا کہ انہیں افسانوں اور لطیفوں سے بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انہوں نے دنیا بھر کے ملکوں کے لطیفے جمع کیے تھے اور لطیفے کی جگہ لفظ "مزاحیہ" لکھتے تھے۔ ہندوستانی مزاحیے، سنساری مزاحیے، جامعی مزاحیے، لطیفوں کے مجموعے ہیں: "نئی نئی کہانیاں" اور "ان سنی کہانیاں"; افسانوں کے مجموعے ہیں کہانیاں زیادہ ترجمین زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ بقیہ سنے سناٹے لطیفے، حکایتیں، دلچسپ روایتیں ہیں۔ یہ سارا ذخیرہ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ ان کے علاوہ ان کے مطبوعہ مضامین بھی کچھ کم نہیں ہیں، جو ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں منتشر ہیں۔

زندگی کے آخری دو سال انٹریڈیول کے کیلبر سے بیمار رہے۔ اسی سے ۲۵ جون ۱۹۷۳ء شام کے سات بجے انتقال ہو گیا۔ جنازہ اگلے دن اسٹامپا، مولانا تقی حسن دفا لے نماز جنازہ پڑھائی اور درگاہ میر یوسف من، حیدر آباد میں سپرد خاک ہوئے۔

حمید ناگپوری، عبدالحمید

نسلاً قریشی تھے۔ دراصل ان کا خاندان حیدر آباد دکن کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے کوئی بزرگ تلاشِ معاش میں ناگپور چلے آئے تھے۔ حمیدہ نومبر ۱۹۰۷ء کو یہیں ناگپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ رسول صاحب اپنا آبائی پیشہ نقالی کرتے اور اس سے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتے۔ لیکن حمید سات برس کے تھے کہ بد قسمتی سے ان کا انتقال ہو گیا۔ بارے شیخ رسول کے چچا زاد بھائی حاجی شیخ علی نے اس بے یار و مددگار خاندان کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لی۔ سنی شعور کو پیچھے، تو والدہ نے انھیں پڑوس میں حکیم سید بہادر الدین قاری کے حوالے کر دیا، جو شیخ رسول مرحوم کے دوستوں میں سے تھے۔ ان سے اردو اور فارسی اور کچھ مذہبی کتابیں بھی پڑھیں۔ پھر چندے ایک اور بزرگ حکیم تاج محمد خان کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی تعلیم شیک طور پر ہوئی نہیں۔ مبراہی کا جو عالم تھا، اس کے باعث کسی باقاعدہ اسکول میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان اساتذہ سے جو کچھ حاصل ہو سکا، اسی پر آگاہی پڑی اور وہ بھی کتنا ہوا ہوگا۔ غرض اس پہلو سے انھوں نے جو کچھ ترقی بھی کی، وہ ان کے اپنے اندر بازوی کا ثمرہ تھی۔

ان کی پوری زندگی داستانِ غم ہے۔ ان سے چھوٹی ایک بہن تھیں۔ بڑی مشکوں سے اس کی شادی کا مرحلہ طے ہوا تھا کہ وہ ایک سال بعد داغِ سارقت دے گئیں۔ والد، یہ چاری جو پہلے ہی تنوں کی ماری تھیں، ایٹنی کی جوانا مرگئی کا صدمہ برداشت

ذکر کریں، اور کل کل کچھندی دن میں اللہ کو پیاری ہو گئیں، تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان چٹے بعد دیگرے حادثات سے عہد صاحب پر کیا بیت گئی ہوگی! لیکن قدرت نے اسی پر بس نہیں کی۔ رہی سہی کسر ایک ”ہڈ باقی حادثے“ نے ہڈی کر دی۔ اسی زمانے میں کسی کی ”نگر افغانۃ“ ان پر پڑی، غریب نے ضیاں کیا کہ شاید زندگی بسر کرنے کو سہارا مل گیا ہے۔ لیکن وہ ناقون بھی چند دن بیمار رہ کر چاک موت کا شکار ہو گئیں۔ اب عمریاں کی دنیا تاریک ہو گئی۔ دل میں نشان لے کر ساری عمر حجاز میں گزار دوں گا۔ لیکن تاجک دوست احباب کے کہنے سننے پر ۲۲ سال کی عمر میں ایک جنگ اپنی پسند سے نکاح کیا۔ غمگراور دلدار بیوی جو ملے، تو اس کی رفاقت میں وہ گزشتہ معاش کی تلخیاں بھولنے لگے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو یہ بھی منظور نہ ہوا، شادی کے دوسرے ہی سال بیوی بھی اعانۃ ان کا نام سقاۃ غلہ آشتیان ہو گئی۔ مدقون اسی طرح بسر ہوئی۔ آخر بشکل شیخ علی کے سلسلہ امرامہ وہ نکاح ثانی پر رضامند ہوئے۔ اس ہیگم کے بطن سے ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ ایک بیٹا جعفر سنی میں دارج دے گیا، دوسرا (محمد ابراہیم) ایک نیم سسکاری و فرتیں ملازم ہے۔ لڑکیاں سب شادی شدہ ہیں گھربار کی ہیں۔

ساری عمر ان کا ذریعہ معاش بس اتنا رہا کہ اس سے مہم دجان کو بچا رکھے گا سالان پیدا ہو جاتا تھا، شروع میں گوشت کا آبائی کام کیا۔ پھر کوٹلے کا کاروبار کرتے رہے، انگریز کی نال بھی بنائی۔ اس سے جو آؤ تو مدخل گیا، صبر و شکر سے اس پر قانع رہے۔ لیکن ۱۹۶۳ء میں فالج کا حملہ ہوا اور وہ نقل و حرکت سے معذور ہو گئے۔ دکان کی دیکھ بھال کون کرتا! آخر ان کے احباب نے ہاتھ پاؤں مارے اور ہمارے دفتر حکومت کو توجہ دلائی، جہاں سے ان کی ادنیٰ خدمات کے اعتراف میں پچاس روپہ ماہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا، جو تا دم مرگ ملتا رہا۔

فالج کا مستقل مارہ نہ تو تھا ہی، آخری چند ماہ میں اس پر سوزش بول کے موزی مرض کی معیبت مستزاد ہو گئی۔ یکم جولائی ۱۹۷۳ء سے طبیعت بگڑنا شروع ہوئی۔

جمعہ ۹ جولائی ۱۹۷۳ء میں البصائر پانچ بجے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اسی دن بعد نماز جمعہ قبرستانِ مومن پورہ، ناگپور میں آخری خواہنگاہ میں پہنچا وہیں گئے۔

حمید صاحب نے طبیعت حساس پائی تھی۔ مگر کے جو حالات تھے، وہ تو ظاہر ہی ہیں۔ ان پر معائب نے انہیں پکا پھوٹا بنا دیا تھا۔ نالے شعر کی شکل اختیار کر گئے۔ وہ تقریباً ۲۰ برس کے سن میں شعر کہنے لگے تھے۔ چندے فنی نواب خان نواب ہندی (لکھنؤ آبادی) سے مشورہ کیا تھا، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن قائم نہیں رہا۔ نواب ریٹے کے ڈاکھالے میں ملازم تھے۔ جب وہ تباہی پر ناگپور آئے، تو حمید ان کی خدمت میں جانے لگے۔ لیکن اس کے جلد بعد ہی وہ ملازمت سے سبکدوش ہو کر ناگپور سے چلے گئے، اور اصلاح کا یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ اس کے بعد اپنی خداداد ذہانت اور طبع سوزوں کی رہنمائی میں خود ہی اپنے کلام کی نوک پلک درست کر کے رہے۔ رفتہ رفتہ سب نے ان کی ہدایت سن کر تسلیم کر لی۔ اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ سپتہ ابوالحسن ناظمی گھاٹو ٹھوڑی (ف ۱۹۶۹ء) نے جو کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے ان کے کلام کی یوں تعریف کی ہے :

ہمیشہ ہی ان کا جوا کلام میں نے سنا، اسے محاسن عقلی و معنوی سے پُر پایا۔
اسے بے سیر و جستجوئی حمید صاحب سے برصغیر ہی ملی گئی چنانچہ نواب تو یہ عالم
ہے کہ جہاں مشرکت مشاعرہ کے لیے جانے کا ارادہ کرتا ہوں، وہاں مستطیل
مشاعرہ پر حمید صاحب کو بلانے کی شرط لگا دیتا ہوں۔ اور جب جاتا ہوں،
تو میری آنکھیں انہیں تلاش کرتی ہیں۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب ”حرف خاموش“ کے عنوان سے اپنا ”کتاب گھر“ کا مٹی (مدیرِ پرورش) نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں غزلیں، نغلیں، تعلعات وغیرہ ہر طرح کا کلام ہے۔ ہنوز بہت کلام مسودوں کی شکل میں پڑا ہے۔ ان کے اشعار ہزاروں ہرگز یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ کسی کم تعلیم یا نثر نویس کا کلام ہے؛ ایک ایک

مصرعے پہنچی فن اور قدرتِ زبان کا ثبوت ملتا ہے ۔

جہاں جھوٹا خاتم نے وقتِ بخت
وہیں ٹھہرا رہا سیرا زمانہ
خوابِ زیست بول، لیکن تری خوشی کے سوا
ترے خار، مجھے زندگی سے کیا لینا !
حمید اہل میں اکلم کو ہے ثباتِ یہاں
مجھے دوام نہیں، اس خوشی سے کیا لینا !
ان کی خاموشی کی افسانہ درافسانہ ہی
ہم نے جو بات کہی، بات سے آگے نہ بڑھی
عشق ہر مرحلہ غم کی حد میں توڑ چکا
عقلِ اندیشہ حالات سے آگے نہ بڑھی
نگہ دوست میں تو کبھی نہیں اس کی، حمید !
وہ جتنا جو مسامحات سے آگے نہ بڑھی
تری یاد اور شاہِ غم کی اور اسی
دیا، جیسے جنگل میں کوئی جلائے
حسنِ خوددار اور عشقِ خود آگاہ اور صبر
غم کے آشکوں سے جلا ہا تا ہے انسان کا خمیر
دل پہ افتادہ اسی افتادہ گزر جاتی ہے !
اُف، یہ عالم کہ ترانام بھی لیتا ہے کوئی

مذہبِ حیات میں، جیت کھال کی، ہار کیا !
چاہے جراتِ بل، فکر و زبان کا رکھا !
سوز و گدازِ عشق سے دل جو ہو لطف آشنا
جنتِ قرب یا رکھا، دوزخِ استغفار کیا !
میتا دے ستم کا، احسانِ حمید مانو
کچھ نفس میں جھوٹے، تم فکرِ آشیان سے
یہ طرفانِ بلا تقدیر سانہ اہلِ ہمت ہے
کوئی حق آشنا کہے، بسکسار ان ساحل سے
حمید ! اس دور میں آسائشِ ہستی کے حاصل !
سکونِ زندگی نا پسید ہے انسان کے دل سے

یہاں مہارت میں ہے لطفِ مزاج
خطا کا ریاں، بھر خطا کا ریاں ہیں
شعرا کی نظر، اور پسینہ یہ ہیں پر
مجبور نہ کر اپنی محبت کے بغیر پر

ذوہ دوہ بارہ شوق ہے، ذوہ غمی غمِ یار ہے
مرا حال زار نہ پوچھے! نہ سکون ہے نہ قرار ہے
جو پیام دوست نہلا سکے جھوٹی نہ دل کی کھلا سکے
وہ نسیم کوئی نسیم ہے، وہ بہار کوئی بہار ہے

دل میں ہے وہی صبر و اظہارِ محبت ہم نے پیکھائی انہیں موبارِ سناری
آہنگ یہ کیسی چمن میں؟ بمصفر و ادیکھنا بچیلوں کی زوئی کس کا آشیانہ آگیا
شب وعدہ تو کچھ رونق درو دیو پر ہوئی نہیں معلوم آخر کیوں یہ ویرانی نہیں جاتی
لگا و آشنا سے مشکوٰۃ بیگا لگی کیسلا محبت کی نظر بھی تم سے پہچانی نہیں جاتی
کیا عشق میں فطرت بھی بدل جاتی ہے دل کی
تکلیف میں آرام ہے، محلوٰم نہیں، کیوں!

مہاتما گاندھی

مرد حق آگاہ گاندھی، ملک و ملت کا وقار
جس کی پیشانی کی منت کش، کلاہِ اخنار
انقلابِ دہر کو شوکر کا جس کی انتظار
جو سمندرِ وقت کا رخ موڑ دے، وہ شہسوار

دہدہنے سے جس کے دشمن لرزہ برانداز تھا
امن و آزادی کا دنیا کے لیے پیغام تھا

پہنچ تھا جس کی نظر میں رنگ و ثنوں کا امتیاز
جس کی نظرت تھی نزاعِ کفر و دیں سے بے نیاز
صاحبِ علم و فراست، نیک طینت، پاکباز
نوحِ انسانی کو جس کی ذات پر تھا فخر و ناز

جس کا مذہب آدمیت کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس کے پہننے میں محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھا

کھول دے تقدیر کے بل جس کے ماتھے کی شکن
 آنکھ سوچے سے ملا سکتا تھا جس کا ہانچیں
 سوئے تڑپتے سے جس کا ہر نفس تھا فطرت
 مسکراتی تھی بول پر جس کے نصرت کی کرن
 ہڈ پڑے فک و جل سے جس کا دل بیدار تھا
 وہ بجا ہوجا ہنسنا کا غلبہ سردار تھا
 سرنگوں تھا جس کے قدموں پہ فرنگی ساراج
 دکھ دیا بھارت کے سر پہ جس نے آزادی کا تاج
 امن و آزادی عالم کو تھی جس کی احتیاج
 پیش کرنا ہے ہیں جس کو عقیدت کا خراج
 مادیہ چندوستان کی شانِ رحمت کی قسم
 اقیانوسِ قوم و ملت کو سا ڈالیں گے ہسم

ضیا بدایونی، ضیا احمد، پروفیسر

یونانی کا تاریخی مشہور بدایونی کسی تفصیل تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ صدیوں تک علم و فضل اور رشد و ہدایت کا مرکز رہا ہے اور اسے اسلامی مہم کی بھدر گزیرہ شخصیتوں کی جنم بھوم ہونے کا فخر حاصل ہے۔ امٹار صوبہ صدی کے آغاز میں حضرت محمد بن ابوبکر صدیق کی نسل سے ایک صاحب علم بزرگ مولانا وجیبہ الدین اپنے خاندان سمیت سنبھل سے بدایون آئے، اور یہاں مولوی ٹولہ میں بس گئے۔ انھیں اصلاف میں کمال احمد صاحب ہوئے ہیں، جن کی فارسی ادبیات اور خطاطی میں ہدایت بدایوں کے اہل علم حلقوں میں آج بھی یاد کی جاتی ہے۔ ان کے تین بیٹے ہوئے، بڑے، طلیح احمد خوشاگر و امیر مینائی (ف اکتوبر ۱۶۱۹۰) انجیلے، رفیع احمد عالی شاگرد سلیم مکھنوی (ف سٹی ۱۶۱۹۱۱) اور طلیح احمد خوشاں شاگرد راشد علی منیا و منیر۔ رفیع احمد عالی وکیل عدالت تھے اس حیثیت سے مدتوں ضلع بدایون کی تحصیل گنوار میں مقیم رہے۔ وہ اپنے والد کی طرح فارسی کے فاضل، اور اردو اور فارسی کے شاعر تھے۔ ان کا ۱۶۱۹۳۴ میں انتقال ہوا۔

رفیع احمد عالی کی اولاد میں تین بیٹیوں کے علاوہ تین بیٹے ہوئے، رضی احمد رضی اور ضیا احمد ضیا اور آفتاب احمد جوہر۔ رضی احمد پولیس کے محکمے میں انسپکٹر تھے۔ ان کے کلام کا ایک مختصر انتخاب "لغات" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (علی گڑھ) انھوں نے ۱۹۳۶ میں رحلت کی۔ چھوٹے بھائی آفتاب احمد ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے پینشن پر سبکدوش ہوئے۔ بفضلہ عرض و خرم بدایوں میں قیام ہے۔

ضیا احمد بروز جمعہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ (۲۱ ستمبر ۱۸۹۹ء) کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ پہلے دن سے قوام کے کمروز اور مفتی تھے؛ اسی باعث اکثر بیمار رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسے بیمار ہوئے کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ نانی نے منت مانی کہ بچہ ٹھیک ہو گیا، تو میں اسے مرنے پر رضا کر عالم و خادوم دین بنا ڈیوٹی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ کہ وہ پھر جوہر طبع کے علاج معلیٰ سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، اس دعا کے بعد ایک معمولی عطار کے ٹونکے سے تندرست ہو گیا۔

جب سنِ خورشید کو پہنچے، تو نانی اماں کی منت کے احرام میں بدایوں کے مشہور مدرسہ شمس العلوم میں بچکا دیے گئے جہاں کا نصاب مدرسہ نظامی پر مشتمل تھا۔ انہوں نے یہاں مولانا صاحب احمد قادری، مولانا محمد براہیم قادری اور مولانا شاہ عبدالقادر (سجادہ نشین درگاہ قادریہ) سے عربی پڑھی۔ عربی کے علاوہ اس مدرسے میں فارسی اور قرآن کی تعلیم پر بھی توجہ دی جاتی تھی۔ یہاں سے فارغ ہو کر انہوں نے حدیث کی سند اور اجازت مولانا سید یونس علی محدث بدایونی سے لی۔

شمس العلوم میں مدرسہ نظامی کی تکمیل تو ہو گئی؛ لیکن چونکہ وہ انگریزی سے بالکل نا بلند تھے، اس لیے ان کے والد نے اب انہیں گورنمنٹ ہائی اسکول، بدایوں میں بھیج دیا۔ یہاں دسویں درجے تک تعلیم پانے کے بعد انہوں نے بریلی کالج میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۱۸ء میں بی اے کی سند حاصل کی، اور ملائی تنخواہ انعام میں پایا۔ اس کے بعد چند سے ملازمت کی اور بالآخر ۱۹۲۲ء میں الزاب دیوبند سٹی سے ایم اے پاس کیا۔ اب انہوں نے ڈاکٹر ذہیب الدین احمد صدر دعوہ سے فارسی کی نگرانی میں "فارسی ادب و تہذیب اکبر" کے موضوع پر مقالہ مرتب کرنے کی تیاری شروع کی لیکن ہنوز کام مکمل نہیں ہوا تھا کہ انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بنگلہ مل گئی اور یہ مقالے سے دست بردار ہو کر علی گڑھ چلے آئے۔ دو برس بعد ۱۹۲۹ء میں وہ وائی کالج، دہلی میں بھی کوئی سال بھر تک ملازم رہے۔ لیکن جلد ہی یہاں سے مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں مدرس (پکڑا) بھی کر علی گڑھ واپس

چلے گئے۔ اصحابِ محل و مقدر نے محسوس کیا کہ اپنی تعلیم کے پیش نظر یہ اردو کی بجائے فارسی کے شعبے کے لیے زیادہ موزوں رہیں گے چنانچہ ان کا تہا دلِ شیعہ فارسی میں ہو گیا۔ وہ وہاں ۱۹۵۹ء تک رہے۔ پہلے مدتوں ریڈر کی حیثیت سے کام کیا، ۱۹۵۹ء میں مسکد شہی سے کچھ پہلے پروفیسر اور صدر شعبہ بنا دیے گئے تھے۔

لازمات نے الگ ہونے پر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں ایئر خسرو پر تحقیقی کام کے لیے وظیفہ دیا۔ ۱۹۶۶ء میں وہ انجمن ترقی اردو (ہند) میں اردو لغت کی ترتیب و تدوین کے کام پر مقرر ہو گئے۔ سال بھر بعد یعنی ۱۹۶۴ء میں دہلی یونیورسٹی نے انھیں اسی کام پر اپنے ہاں بلا لیا۔ یہاں وہ ۱۹۷۱ء تک رہے چونکہ اب بیمار بہت رہنے لگے تھے، خاص طور پر فشارِ دم کا پرانا عارضہ خود کرا یا تھا، اس لیے وہ سید احمد جعفری پر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد بھی ان کا ریا دہ قیام دہلی میں اپنے بیٹے ڈاکٹر ظہیر احمد عتاقی کے ساتھ رہا، اگرچہ علی گڑھ جاتے آتے رہتے تھے۔ علی گڑھ ہی میں تھے کہ ۴ جولائی ۱۹۷۳ء کو انھیں فشارِ دم کے شدید حملے سے بچھڑ آیا۔ ڈاکٹر نے پورے آرام کا مشورہ دیا، جب حالت اور خراب ہو گئی، تو اگلے دن (۵ جولائی) غفلت اور نیم بیداری کی حالت میں انھیں اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ جین دن تک یہی صورت حال رہی۔ ۸ جولائی ۱۹۷۳ء کو صبح تین بجے روحِ قفسِ منعمی سے پرواز کر گئی۔

إِنشَاءً لِلّٰہِ خَاتَمُ الدِّیْنِ مَا سَا اُجْتَعُونَ۔ اسی دن دہلیہر کے وقت تجسیمِ پنجگنی محل میں آئی اور انھیں یونیورسٹی کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے ساتھ گویا علمِ فضل کا دقار، شرافت و وضع داری، انکساری و خود نوازی و فنِ ہو گشتیں جیسا ظہیر احمد کمالی کے قطعہ تاریخِ وفات کا مطلع ہے،

از سرِ اندوہِ قربت پر نکھول سالِ وفات

تاجدارِ علم و حکمت، بادشاہِ فکر و فن

(۱۹۷۳-۱۹۷۲ء)

(۱)

ان کا شکار غالباً ۱۹۰۹ء میں ہدایوں کے قدیم قاضیوں کے خاندان میں جانی منظور حسین

وکیل کی چھوٹی صاحبزادی شکیلہ خاتون سے ہوا تھا۔ ان سے ایک بیٹی (بلیقیں خاتون) اور پانچ بیٹے (حبيب احمد، رفیق احمد، میکش، ظہیر احمد صدیقی، نصیر احمد صدیقی، عین احمد صدیقی) اپنی یادگار چھوڑے۔ سب بیٹے برسرِ روزگار اور خوش و خرم ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ایم اے، بی ایچ ڈی دلی یونیورسٹی میں ریڈر اور سرمد شعبہ اردو ہیں۔

ضیا صاحب نے شعر گوئی اپنے اسکول کے دنوں میں شروء کی۔ شروء میں غزل کی طرف زیادہ میلان رہا۔ لیکن اکبر آزاد آبادی سے ملاقات ہوئی، تو انھوں نے مشورہ دیا کہ غزل گوئی یکاڑی کا مشغلہ ہے، اس سے بہتر ہے کہ مولانا شبلی نعمانی (دف نومبر ۱۹۱۱ء) کی طرح تاریخ اسلام کے مشہور اور سبق آموز واقعات کو نظم کیا جائے۔ چنانچہ ان کا اس سے بعد کا کلام بیشتر اسی رنگ کی منظومات پر مشتمل ہے۔

باقاعدہ تمدن کا تعلق کسی سے نہیں رہا۔ کبھی مزدورت بڑی، تو اپنے بڑے بھائی شعیب دہلوی سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔

حسب ذیل تعنیفات ان سے یادگار ہیں:

- (۱) قصائد سوسن مع شرح (مکتبہ ۱۹۲۵ء)؛ (۲) دیوان سوسن مع شرح (الآباد ۱۹۳۳ء) بعد کو اس کے دو اور ایڈیشن شائع ہوئے (۱۹۳۷ء، ۱۹۵۵ء، ۱۹۶۱ء؛ (۳) تذکار سلف (تاریخی منظومات کا انتخاب)؛ (۴) کیا سوجوہ تصوف خالص اسلامی ہے؟ (محلِ گزشتہ ۱۹۶۸ء)؛ (۵) تجلیات (مجموعہ نظم) (دلی ۱۹۵۳ء)؛ (۶) یادگار حالی (بدایونی) اس میں اپنے والد مرحوم کا کلام مع مقدمہ شائع کیا ہے؛ (۷) لمعات (محلِ گزشتہ) اس میں اپنے برادر اکبر رضی دہلوی کا کلام جمع کیا ہے؛ (۸) تولی سدید (محلِ گزشتہ ۱۹۶۰ء) یہ محمود احمد عباسی مرحومہ کی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کا جواب ہے؛ (۹) مکتوبات (دلی ۱۹۶۷ء) ان خطوط کا انتخاب جو دوسرے حضرات نے ان کے نام لکھے تھے؛ (۱۰) سخن زار (ساہتیہ اکادمی، نئی دلی ۱۹۶۸ء) فارسی شاعری کا انتخاب مع اردو ترجمہ؛ (۱۱) مباحث و رسائل (دلی ۱۹۷۱ء) علمی و ادبی مضامین کا مجموعہ؛ اس پر یوپی اردو کالج نے دو ہزار روپے کا انعام دیا تھا؛ (۱۲) جلوۂ حقیقت (دلی ۱۹۷۲ء) مذہبی مضامین کا مجموعہ

(۱۳) سالک و منازل (وکی ۱۹۷۵ء) فارسی مقالات، ادبی و افتخاری۔ کچھ چیزیں انھیں کر دیوں کا بیشتر وقت، غیر مطلوب رہ گیا۔

بوسے کلام کا مجموعہ نہیں چھپا۔ غنیمت کلیات یا دگر چھوڑا ہے۔ زمانے کی روش بدل گئی، اب اس کے چھپنے کی کیا توقع ہے! اسی سے مختلف اصنافِ سخن کا انتخاب پیش کر رہا ہوں۔

اسلام اور غلامی

اس عہدِ معدلت کا یہ قصہ ہے جب کہ تھا
وہ بادشاہ، نالہ جو جس کا ناشتا
جس کی زبان بھل جکت میں دُرفشاں
حاصل تھا یہ اسی کو تقرب کر، پیار سے
بازار ایک روز گئے، عید کے قریب
دونوں کے پیر میں تھے زمیں کہنہ و روی
ایکان میں نسبت تھا نفیس اور قیمتی
اچھا جو تھا، وہ اُن کو دیا، خود بُرا لب
تنبہ نے عرض کی کہ جو بہتر لباس ہے
امرا انتہا سے بڑھا جب رفیق کا
تم ہوا بھی جواں ہے تھل روا تھیں
چیزانِ خواجگی و غلامی کا تذکرہ

محسنِ اسلام
(حکامندھی جی)

اے وہ کہ تو نے جہاں سے شاہِ سزیز کو
لے وہ کہ تیرے خون کی ہر ایک بوند لے
لے وہ کہ تو نے معشرِ اسلام کے لیے
ازاد کی نمبر پر قربان کر دیا
ہندوستان میں امن سامان کر دیا
دشوار کی حیات کو آسان کر دیا

تیرے ہر ایک قطرہ خون نے جہان میں
تھی تیرے دم سے پیکرِ جہر و دفا میں بہان
جس دن دوا دہندہ مسلم تھی تیری وراثت
کیا نشہ شرابِ تعب تھا جس نے ماہ
نہے جُستِ حریت کی قہا تن پہ ہند کے
بھارت کو تھی دنوں سے طیدان کی طلب
مسلم کو بھی ہے جیسے کا حق خاکِ ہند میں
پہونچوں سے شمعِ دیں کو بجھانے چلے تھے جو
چھایا تھا مسجدوں کی فضا پر جو ابرِ جو
بھولے اب نہ اہلِ وفا جس کو شہر تک

نہا ہے تجھ کو حسین اسلام کا لقب

تھی لے یہ رعبہ تجھے پہچان کر دیا

مروج کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ کھل نہیں ہو گا، اگر ان میں سے چند موقوفہ
کر دی جائیں؟

تاریخ و وفات سید نظام الدین شاہ دیگر اکبر آبادی

گئے خراپہ بستی سے حضرت دیگر
جو گو خضر ہوا یہ عالمِ ظلم آلِ نصیب
کہا نہ دے جلے یوں عزیز نے سال و سال
نصیب گلشنِ فردوس میں قیام ہوا
تو فکرِ سال کا منظورِ بہتام ہوا
کہ ملکِ ظلم و ادب حیف بے نظام ہوا

(۱۳۵۳ + ۱۳۵۱)

۳)

بوفاتِ فاضل میرور، شاعر مشہور حضرت احسن مارہروی مغفور

وہ جناب احسن مارہروی
یاد آئیگی جب ان کی مصیبتیں
خدمتِ شعر و ادب تھا جن کا کام
تڑپ لگا جسے میں طلبِ شہام

۷ ہر ایک تاریخ کے ساتھ خاص طویل قلم ہے! میں نے صرف چند شعرا و شاعرا پ کر لیے ہیں۔

عرض ہے حق سے کہ ان کی قبر پر بارش بارانِ رحمت ہو مدام
ہے ضیا اگر فکرِ تاریخ و فطانت

(۱۳۵۹)

تاریخِ رحلتِ حضرت اخی و استادِ مولوی حاجی رضی احمد صاحب رضی:

ہے عارفِ سنت بڑے بھائی کی رحلت یاد آتے ہیں جب ان کے وہ الطافِ نوازاں
مجھ کو بھی فنِ شعر میں خامی کا ہے مدنا
تاریخ بھی رحلت کی "ضیا" ہے یہ دعا بھی
تفصیل کا یار ہے رباں میں، درکلم میں
بند و جاق ہے آشوں کی ہمزیِ قرشِ الم میں
ما کی کی طرح حضرت استاد کے غم میں
"مہمان ہوں" وہ دارِ چستانِ ارم میں

(۱۳۵۸)

حق و محبتی فاضلِ نعلِ مولوی یعقوب بخش راجب بدایونی:

وہ راجب، وہ حسنِ چہرِ حسن
ضیا: کہ مصرعِ تاریخِ رحلت
جو نکلا مآثرہ میں لے سنا یا
نہیں جن کا بدل ہندوستان میں
پر فرمایش تھی بزمِ دوستان میں
"گئے راجب گلستانِ بدایونی"

(۱۹۹۸-۵۰۔ ۶۱۹۳۸۰)

۵۰

جناب مولانا عبد القدیر قادری بدایونی:

عالمِ دین حضرت عبد القدیر
آہِ خدمت ہو گئے شوال میں
وہ دعا یاد اب اہوان کے زبیرِ فرق
کردم تاریخ اس غم کی، ضیا
فی الفضائلِ ذی کرم، ذی سحر
اس جہاں سے سونے دارِ آخرت
تا جگہ سے ریاضِ مغفرت
"انتقالی عالمِ نیک کو صفت"

(۱۳۷۹)

تاریخِ وفات ڈاکٹرِ ہادی حسن:

فاضلِ شیریں بیاں ہادی حسن
پردہِ لاشِ شمعِ ایوانِ کمال
ناگہاں روشِ از قضا غاموش شد
حیف! از بادِ فحاشِ موش شد

گفتش سال از سرچرخ عالم طوطی گویا جے اظہار مشق خد
(۱۳۴۳ ر ۱۳۶۲)

غرض کتنی تاہیں نقل کروں۔ ان کی بیاض میں بے باغ و سبکدوش تاریکیاں ہیں۔ دیکھو
کے ہاں دلالت، شادی، غمی کی انہی کے حقیقے کی رسید کسی کی کتاب کی طباعت کی،
ہر طرح کی تاریکیاں ہیں۔ مرحوم محمد بہت کرم فرماتے تھے۔ انہی میں دوناہیں میرے
معلق بھی ہیں! انہیں شامل انتخاب کر رہا ہوں تاکہ یادگار رہیں۔

۱۹۶۵ء میں ہماری چھوٹی بیٹی بشری کی شادی ہوئی، تو انہوں نے تاریخ بھی:
تاریخ عقد بشری دختر مالک رام صاحبہ

جب طوطی ہمایون نے کراں ہر غم است اندر غم عیش غم
بہر تاریخش خرد و شاد را گفت: "والتا قوم بشری نکم"
(۱۳۸۵ء)

۱۹۷۱ء میں میرے لیے اجاب نے تین جلد (اردو اور انگریزی) میں ایک انگریزی
کتاب مرحب کی، جسے راشترتی شری دیواری گری بالقابہ نے ایک خاص تعریف
میں "جو راشترتی بھون میں منعقد ہوئی تھی، مجھے پیش کیا۔ اس موقع پر مرحوم نے
تاریخ بھی:

قطعہ تاریخ نگاہ واری "جشن مالک رام" بحمدت فاضل موصوف:

زہ میر سپہر مسلم مالک نگہ دارد حق از بیم ذوالش
نختہ "مغائے" کہ اینک آمد دلیل تازہ براوج کمالش
ہوا خواہاں زبیں و شاد گشتند پشتر نیچے کہ دادہ ذوالجلالش
بہن گفتہ سر و ش "از موعے الہام ہمایول بخت روشن فکر سالش

(۱۹۷۱ - ۱۹۷۰)

(۱)

اب آخر میں چند شعر غزل کے بھی ملاحظہ ہوں:

مدتے، اے مشق لغتور! تری رنگینی کے غلہ نفا رہے گوشہ مری تنہائی کا

سہ اشارہ بہ کتاب "ارمغان مالک" (ضیاء)

حُسنِ فطرت کا بہر رنگ نہ پایا ہوتا	کبھی مہنر، تو کبھی گلِ خندان ہوتا
حُسنِ پھر حُسن ہی ہے لاکھ خطا دار سہی	بھڑے دیکھا نہ گیا ان کا پیشاں ہوتا
میں ہوں المدد ہے اور گوشہ تنہائی ہے	وہ ہیں، اخیار ہیں، اور انجمن آرائی ہے
حق کا منتا ہوتا، ہے برا تا منتا کا	مجھے مشکور سنی ہے اثر معلوم ہوتی ہے
کہاں تھی دلکشی یہ جلوۂ حُسنِ خود آرائی	مری رنگینی زو فی نظر معلوم ہوتی ہے
نہیں کم مرگِ حسرت بھی حیاتِ تلخ گامی سے	وہ تھی دشوار، یہ دشوار تر معلوم ہوتی ہے
جنوں سجدۂ وسیم کا اہواز اے ضیا! دیکھو	جہین شوقِ حُز و سنگ در معلوم ہوتا ہے
انوارِ حقیقی کی، اندر سے، نظر سوزی	بے پردہ ہیں اور پردہ ہے چشمِ تماشاے
کچھ کشاکش، سستی سراپہ سستی ہے	سرجوں نے کہا بڑھ کر یوں ساحلِ دریاے
وہ سامنے ہیں مگر کبھی عجزِ حقیقی ہوں	تصورِ حقیر ہوں، نیز نگہ تماشاے
ہے وہی طور، وہی برقی حقیقی، لیکن	دشتِ ایمن میں نہیں سونپی عمراں کوئی
اب نہ وہ رنگ ہے غمخوں میں، نہ بوجھ لول ہیں	لے گیا ساتھ یہاں یہ پستاناں کوئی
کھل ہی گیا سب رازِ دل ان کا	چشمِ سخن آرا کی زبانِ
جان کی قیمتِ عشق کی غفلت	میں نے نہ کبھی، تم نے نہ جانی

سجاد ظہیر، سید

ان کا خاندان ضلع جوہر (دہلی) کے چھوٹے سے گاؤں کلاں پور کا رہنے والا تھا۔ یہ لوگ دراصل زمیندار تھے، اگرچہ انہوں نے ملازمت شروع کر دی تھی چنانچہ سجاد ظہیر کے دادا سید ظہیر حسن صاحب تحصیلدار تھے، اور والد سید وزیر حسن اپنے زمانے کے کامیاب ترین وکلاء میں سے تھے۔ سید وزیر حسن نے شروع میں چندے پر تاپ گڑھ میں وکالت کی اور اس کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے۔ وہ ملکی سیاست میں بھی بہت مرگم تھے، بہت دن تک آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری رہے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور ہنگامہ کا جو سیاسی مہم جوہ لکھنؤ میں ہوا تھا، اس میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ رفتہ رفتہ وہ پہلے اودھ چیف کورٹ میں جج مقرر ہوئے اور بعد کو اس کے چیف جج بن گئے۔

سید وزیر حسن کا ہندوؤں کے درہات بڑا گاؤں کے ایک اور زمیندار کی صاحبزادی سکینہ الفاطمہ بیگم (عرف شکتی بی بی) سے نکاح ہوا تھا۔ ان کی اولاد میں پانچ صاحبزادے ہیں، علی ظہیر حسن ظہیر، حسین ظہیر، سجاد ظہیر، باقر ظہیر، بقیہ اللہ تعالیٰ سب نے اپنے اپنے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

سید سجاد ظہیر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ عام طور پر ان کی تاریخ ولادت ۵ نومبر ۱۹۰۵ء لکھی گئی ہے۔ اس میں مبینہ طور پر دو درست ہیں، لیکن سال ٹھیک نہیں؛ ۱۹۰۵ء کی جگہ ۱۹۰۴ء چاہیے۔ میں نے ایک دن خود ان ہی سے اس معلوم عوام تاریخ کی تصدیق چاہی، تو کہنے لگے کہ سرکاری کاغذوں میں یہی تاریخ لکھی ہے؛ لیکن ہوا یہ کہ جس دن باپا (والد) مجھے اسکول میں داخل کرانے کو لے جا رہے

تھے، پوجو (والدہ) نے ان سے پوچھا: اس کی پیدائش کی تاریخ کیا نکھواؤ گے؟ باپا نے جواب دیا، جرنیک تاریخ ہے، وہی نکھواؤ نکلا۔ اس پر پوجو نے کہا: ایک سال کم نکھواؤ دینا۔ باپا نے فرمایا، بہت اچھا یہی کر رہا تھا چنانچہ انہوں نے تاریخ ولادت ۵ نومبر ۱۹۰۴ء کی بجائے ۵ نومبر ۱۹۰۵ء درج کرادی، اور یہی شہور ہو گئی۔

سجاد ظہیر کی تعلیم کنسٹو میں ہوئی۔ ۱۹۲۷ء میں اپنے بڑے بھائیوں کی طرح یہی آکسفورڈ بھیج دیے گئے۔ سٹیڈنڈرٹ حسن چاہتے تھے کہ سجاد ظہیر آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی اے (آنرز) کی سند لیں اور انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے بڑے افسر بنیں اور یوں ان کے خیال میں کامیاب زندگی بسر کریں۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب ہوا، جس نے مدیوں کی زارشاہی کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس واقعے نے بین الاقوامی سیاست میں بلا مبالغہ زلزلے کا کام کیا۔ جہاں بادشاہوں اور سرمایہ داروں اور نوکریاں نے اسے اپنے اقتدار کے لیے خالی ہڈیاں کیا، وہیں عوام نے اس کا پُر خوش خیر قدم کیا۔ بیشتر ملکوں میں اس انقلاب کی یادگار کے طور پر اکتوبر کلب قائم ہوئے، جن میں نوجوان ترقی یافتہ شامل ہونے لگے۔ ایسا ہی ایک کلب آکسفورڈ میں تھا۔ سجاد ظہیر بھی اس کے رکن بن گئے۔

سجاد ظہیر اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں شروع سے باغیاد خیالات کے تھے۔ وہ جو بلی بائی اسکول کے دسویں درجے میں پڑھتے تھے وہیں ہندو مولہ برس کا بن ہو گا۔ جب ۱۹۱۹ء میں ترکہ مملکت اور خلافت کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ سجاد ظہیر پر ان کا بہت اثر ہوا۔ اگرچہ اپنے خاندانی ماحول کے پیش نظر ان سے بڑا اپنی ہمدردی یا انگریز کی مخالفت کا اظہار تو نہیں کر سکتے تھے، لیکن عقائد و مشابہ میں حکومت ہزاری کا جو جذبہ ان کے دل و دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ مردہ زمانہ کے ساتھ نشوونما پا تا رہا، اور جب انہیں آکسفورڈ میں آزاد فضا میسر آئی، تو وہ

برگ و بارے آیا۔ آکسفورڈ کلب میں کس قسم کی گفتگو ہوگی، وہاں کون لوگ کسی تقریریں کرتے ہوئے، اس سب کا آسانی سے تصور کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سال بھر میں سبھا دلیر لے پہنے والد کی خدمت میں لکھ دیا کہ میں آئی، جی! اس نہیں بننا چاہتا سید وزیر حسن صاحب نے اس پر ہادی ناخواستہ رعنا مندی کا اظہار کر دیا اور کہا کہ اچھا پیرسٹری کا امتحان پاس کرو۔ سبھا دلیر پیرسٹری کے بھی تھی میں نہیں تھے، وہ اپنے مستقبل کا کچھ اور لامعہ عمل بنائے تھے، جس میں وکالت کی کوئی جگہ نہیں تھی، لیکن اب انہوں نے دوبارہ والد کو نقصاننا سب خیال نہ کیا۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۳۷ء میں وطن واپس آئے، تو بی۔ اے (آنکس) بھی تھے اور پیرسٹری بھی؛ لیکن اس کے ساتھ وہ پچھے کیو لیسٹ بھی تھے۔

ہندستان واپس آنے کے بعد انہوں نے ادبی اور سیاسی دونوں محاذوں پر کام شروع کیا۔ وہ اپنی تعلیم کے دوران (۱۹۳۱ء) میں کوئی چھ مہینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ اس زمانے میں انہوں نے یہاں سے انسانوں کا ایک مجموعہ ”انگارے“ کے نام سے چھاپا۔ اس میں کل دس انشے تھے، پانچ خود ان کے، دو احمد علی کے ایک انسان اور ایک ڈرامہ شہید جہان کا اور ایک محمود انظر کا۔ ان سب انسانوں کا معیار کسی طرح بھی بلند نہیں کہا جاسکتا؛ یہ زبان اور بیان کی خامیوں سے بھی مبتلا نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے ہماری انسان نگاری کو ایک طرح سے تیارش ملا۔ ان میں سماجی اور مذہبی مسائل پر جس بیباکی اور صاف گوئی، بلکہ کہیں کہیں عریانی سے اظہار خیال کیا گیا تھا، وہ ہمارے ادب میں بالکل نئی چیز تھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ولایت میں لارنس، جوائس، فرانکس، فرائڈ وغیرہ کی کتابیں ان کے زیر مطالعہ رہی تھیں جن کی تقلید میں انہوں نے یہ انشے لکھے اور طبع کرائے۔ بہر حال ان کا یہ تجربہ بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ بیشتر معلقوں سے کتاب کی مخالفت میں آواز بلند ہوئی اور آخر حکومت وقت نے اسے ضبط کر لیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنا مختصر ناول ”لندن کی ایک رات“

سبھی شائع کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں یعنی ہندوستان واپس آنے سے کوئی سال بھر پہلے، انھوں نے لندن ہی میں ملک وراج آنڈر جیوٹی گھوشس پر پیر و سین گپتا، انجدرین تاشریکے ساتھ مل کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ اس کے اغراض و مقاصد کا پہلا مستودہ جیوٹی گھوش نے تیار کیا، پھر اس پر سب نے مل کر بحث کی اور نوک پلک درست کر کے اسے آخری شکل دے دی۔ اس کا مقصود یہ تھا کہ ادب مقصدی ہونا چاہیے! اسے حرام کی زندگی اور تہذیبی روایات، خواہشات اور تمنائوں کا مظہر ہونا چاہیے! اور سب سے بڑھ کر اسے سراپہ داری اور استعمال کا مخالف ہونا چاہیے، تاکہ لوگوں کی تربیت ہو سکے، اور وہ آزادی کی سی بیش بہا نعمت کی تدبیر چھانیں اور اس کے حصول اور اس سے متنع ہونے کی تیاری کر سکیں۔ اس میں اردو یا کسی زبان کی تفصیل غیبہ ہوتی، جبکہ ہندوستان کی سب زبانوں کا ادب ایک وقت ان مقاصد کی تکمیل اور ملک کو آزادی کی مشاہراہ پر ڈالنے میں متحد و معاون ہو سکتا تھا، اس لیے انجمن کا یہ مقصد بھی تھا کہ ملک کی سب زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے اور ان کی تخلیقات کے دوسری ملکی زبانوں میں ترجمے شائع ہوں، جس سے ملک کی ادبی ترقی میں توازن اور یکجہتی پیدا ہو سکے۔

سہا دلگیر نے لندن سے اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی نقلیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں اپنے دوستوں کو بھیج دی تھیں، اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے اپنے اپنے حلقے کے ادیبوں کو دکھا کر ان کی رائے معلوم کریں اور ہو سکے تو ان کی تائید حاصل کر کے ان سے اس دستاویز پر دستخط کرائیں۔

سر وزیر حسن اودھ کورٹ سے سہلہ دش ہونے کے بعد لکھنؤ سے نقل مکان کر کے الہ آباد میں مقیم ہو گئے تھے، اور یہاں باقاعدہ دکانت کرنے لگے تھے۔ سہا دلگیر ۱۹۳۶ء میں وطن واپس آئے، تو لا محالہ والدین کے پاس الہ آباد میں رہنے لگے۔

اس وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا مرکزی دفتر ندرہاٹن کی ماہانہ عمارت آندھراپور
 اور آبا میں تھا اور جواہر لال نہرو اس کے کاموں کے کنٹرول کرتے تھے۔ انہوں نے سجاد ظہیر
 اور ان کے ساتھ کے چند نوجوانوں کو کانگریس کی تنظیم میں مختلف ذمہ دار عہدوں
 پر تعینات کر دیا۔ چنانچہ سجاد ظہیر اس زمانے میں آل آبا و سنی کانگریس کمیٹی کے سکرٹری
 مقرر ہوئے تھے۔ اب انہوں نے ملک کے مختلف صوبوں کا دورہ کیا۔ تقریباً دو سال تک
 وہ پشاور سے مدراس اور کراچی سے کلکتہ تک زمین کا گز بنے رہے۔ ہر جگہ انہوں کے
 تعاون سے شہر شہر انجمن کی شاخیں قائم کیں، اور اس کی کل ہند کانفرنسیں منعقد کیں۔
 یہ حقیقت ہے کہ چند ہی برس میں ادبی محاذ پر یہ تحریک سب سے زیادہ فعال
 اور نتیجہ خیز بن گئی۔

لیکن حکومت کی نظر میں سجاد ظہیر کی یہ تمام سرگرمیاں خلافِ قانون تھیں۔ ان کی تباہ
 انگلستان کے زمانے سے نگرانی ہو رہی تھی۔ اوائل ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمی
 جنگ شروع ہو گئی۔ کیونست اس میں انگریزوں کے خلاف تھے اور برطانوی
 سامراجی جنگ قرار دے رہے تھے۔ اس پر حکومت ہند نے سب کیونست کارکنوں
 کی گرفتاری کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء میں سجاد ظہیر بھی گرفتار کر کے سنٹرل جیل
 لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ یہاں وہ کوئی سال بھر رہے ہونگے کہ بہت بیمار پڑ گئے اور
 انہیں جیل سے ہسپتال کالج منتقل کر دیا گیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد جرمین انوائس نے
 دوسرے ہسپتال کر دیا۔ اب کیونست پارٹی کا رویہ بدل گیا اور متعدد دوسرے
 رہنماؤں کے ساتھ سجاد ظہیر بھی دو سال کی قید کے بعد مارچ ۱۹۴۲ء میں
 رہا ہو گئے۔

کیونست پارٹی کی زیرِ ہدایت سجاد ظہیر اپریل ۱۹۴۲ء میں بمبئی چلے گئے اور وہاں
 سے انہوں نے ہفتہ وار "نویں جنگ" جاری کیا۔ یہ اخبار بہت کامیاب رہا، اس
 کی اشاعت دس ہزار تک ترقی کر گئی تھی۔ اس دوران میں سر وزیر حسن بہت
 بیمار رہنے لگے تھے۔ ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ اس لیے والدہ کے

امداد پر انھیں جبرلائی ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ واپس آنا پڑا، جہاں اپنی بیماری کے زمانے میں سردار حسن عظیم تھے۔ اسی حالات میں ۳۱ اگست ۱۹۴۷ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

جب تک ملک تقسیم نہیں ہوا تھا، کیونٹ پارٹی بھی ایک تھی اور اس کی تنظیم بھی ایک۔ پاکستان بننے کے بعد اس کا ایک عمومی جلسہ اپریل ۱۹۴۸ء میں نکلنے میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان کی الگ تنظیم کرنا چاہیے۔ اس کام کی تکمیل کے لیے جناب دین الدعا بدین احمد (ریڈ اے احمد، ممبر پارلیمنٹ) سے کہا گیا۔ لیکن کسی وجہ سے انھوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ اب قمر ظفر خاں سجاد ظہیر کے نام پڑا۔ اور حکومت ہند نے کیونٹ پارٹی کو طلاق قانون انجمن قرار دے دیا اور اس کے پیشتر فیڈرل گورنمنٹ آرکائیو کیا۔ سجاد ظہیر بھی حراست میں لے لیے جاتے۔ لیکن یہ اس زمانے میں بہت ہمارا اور وہیں نکلنے کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھے، اس طرح گرفتاری سے بچ گئے۔ لیکن ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ جب طبیعت کچھ بحال ہوئی، تو یہ پچیس بدلے ہوئے لکھنؤ آئے اور پھر اسی طرح پچیس بدل کر اپنی والدہ کو بتائے بغیر ایک دن بمبئی اور وہاں سے ہوائی مہباز سے کراچی چلے گئے۔ یہی سبھی صرف اتنا کہا کہ میں باہر جا رہا ہوں، ایک سال تک واپس آجاؤنگا۔

لاہور میں رہ کر انھوں نے پاکستان کیونٹ پارٹی کی تشکیل کی اور اس کے جنرل سیکرٹری بن گئے۔ اسی زمانے میں پاکستان کی حکومت نے بھی کیونٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ لہذا یہ لوگ چپ چاپ اپنے کام کرنے پر مجبور تھے۔ سجاد ظہیر کو بھی رڈ پوزیشن ہونا پڑا۔ انھوں نے اس دور کا ایک لطیفہ سنایا تھا۔

پاکستان (سوویت روس) کے مشہور ادیب ترسٹون زادہ اس زمانے میں لاہور آئے۔ مدرثا انھیں معلوم تھا کہ سجاد ظہیر وہاں ہیں۔ انھوں نے کسی دوست سے دریافت کیا کہ سجاد ظہیر کہاں ہیں، میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ترسٹون زادہ انگریزی میں نہیں جانتے؛ انھوں نے سوال فارسی میں کیا تھا۔ مخاطب پاکستانی دوست جواب میں کہنا چاہتے تھے کہ سجاد ظہیر آج کل ”انڈر گراؤنڈ“ ہیں، لیکن وہ فوراً اس کے لیے فارسی

کا افلا تلاش نہ کر سکے۔ انہوں نے منتقلی ترجمہ کرنے ہوئے کہا، سجاد ظہیر زیر پرز میں رقتہ است۔ ظاہر ہے کہ ترسوی زادہ اس کا اس کے سوائے اور کیا مطلب یعنی کہ سجاد ظہیر کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس پر انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہ یہ حادثہ کب اور کیونکر پیش آیا؟ اس پر پاکستانی دوست نے بہت مشکل سے انہیں سمجھایا کہ ان کا کیا مذاحتاج بہ حقیقت کھلی، تو دونوں بہت ہنسے۔

سجاد ظہیر کیونست پارٹی کے رکن ہونے کے باعث بہت دن مہربوش رہے۔ آخر کار حکومت پاکستان نے ۶۱۹۵۱ میں مشہور راولپنڈی سازش کے مقدمے کی سازش بیل ڈال دی۔ اس مقدمے کے لمبوں میں بہت سے فوجی افسروں کے علاوہ چاربول کے آدمی بھی تھے، سید سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، محمد حسین عطا اور بیگم نسیم ایسجر جنرل اکبر خان کی بیوی)۔ سجاد ظہیر پہلے سے مہربوش تھے اور پوری تلاش کے باوجود پولیس کو ان کا سراغ نہیں ملا تھا۔ مقدمہ شروع ہوا، تو حکومت کو ان کی مزید تلاش ہوئی۔ اس زمانے میں خان قربان علی خان پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے حکومت نے ان سے ناکیدنا کہا کہ خواہ کچھ ہو، سجاد ظہیر کو بلا تاخیر گرفتار کر کے پیش کرو۔ اس پر خان صاحب نے اپنے دست راست جو دھری محمد اصغر کو بلا کر حکم دیا کہ تم ہفتے بھر میں سجاد ظہیر کو گرفتار نہیں کرتے، تو اپنے آپ کو لازمت سے برطرف سمجھو۔ اس پر پولیس نے اپنی تنگ و زوالی صاف کر دی۔

پولیس کو ایک مکان سے متعلق پہلے سے کچھ شبہ تھا کہ سجاد ظہیر شاید اس میں چھپے ہوئے ہیں، لیکن انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں کی تھی۔ اب جو دھری محمد اصغر کو جو نوکری سے برطرف کی دیکھی تھی، تو انہوں نے سب سے پہلے اسی مکان کا سراغ کیا۔ راتوں رات اس کے سامنے کے خالی قطعتہ زمین میں لکڑی کی ٹالی قائم کر دی، غصہ پولیس کے سپاہی مکان چلانے لگے، اور پولیس ہی کے آدمی زیادہ لاکھ بھی تھے، فرض اس طرح ۲۴ گھنٹے اس مشتبہ مکان کی نگرانی ہونے لگی۔ پولیس نے دیکھا کہ ایک نازک سا

وہاں ہاں آدمی اس مکان پر صبح شام آتا ہے، اور تھوڑی تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر چلا جاتا ہے۔ بوجھ بوجھ سے چٹا چٹا کر وہ کیونٹ پارٹی کا باقا عہدہ رکن ہے۔ اسے گرفتار کرنے پولیس نے اپنے ہتھکنڈے جو استعمال کیا، تو اس نے اُگل دیا کہ واقعی سبجا دلیر اس مکان میں پوشیدہ ہیں اور میں صبح شام انہیں کھانا پہنچانے آتا ہوں۔ پولیس نے اگلے دن اسے برقع پہنا کر ساتھ لیا اور کہا کہ اپنے مخصوص طریقے سے مکان کا دروازہ کھٹکناؤ، تاکہ سبجا دلیر کو کسی طرح کا شبہ نہ ہو۔ اس کو آواز جو سنی تو سبجا دلیر نے اندر سے کنڈی کھول دی۔ بھیس بدلنے کو یہ اس زمانے میں بڑی بڑی مونچھیں رکھے اور فرنیچر کے مخصوص گھیر وار شلوار اور سلیٹی رنگ کے بے کرتے میں جوس بختے؛ اور اپنے حلقے میں "مولانا" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ محمد اسفر نے ان سے پوچھا، آپ کا نام؟ انہوں نے خیال کیا کہ اب جھوٹ بولنا بیوقوف ہے، انھیں تو ختم ہو ہی گیا ہے۔ چنانچہ نہایت اطمینان سے کہا: سبجا دلیر۔ عزیز محمد اسفر اپنی ساری سخاوت و اہمیت کے باوجود ان کے سکون اور بے پروائی کے انداز سے بھونچتا رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے منہ سے آواز نکلا نہ نکلی۔ جب اس کے حواس کچھ بجا ہوئے، تو اس نے آگے بڑھ کر پستول ان کی چھاتی پر رکھ دیا اور کہا کہ میں آپ کو گرفتار کرتا ہوں، اپنے آپ کو حوالے کر دیجیے۔ اور یوں انہیں حراست میں لے لیا۔

مادہ لینڈی سازش مقدمہ چلا۔ وکیل سرکار نے تو ان کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا تھا، لیکن عدالت نے چار برس قید کا حکم سنایا۔ انہوں نے صرف دو سال قید کیا اور (سندھ) اور (بلوچستان) کے جیلوں میں کائے فیض احمد فیض اور یہ جیل میں ایک ساتھ رہے تھے۔ فیض کا مجموعہ کلام "زندہ نامہ" اسی زمانے کی یادگار ہے۔

ہوا یہ کہ ہندوستان کا حکومت نے حکومت پاکستان پر ان کی رہائی کے لیے زور ڈالنا شروع کیا۔ دنیا کے اور ممالک کے افسروں نے بھی حکومت پاکستان سے اپیل کی۔ یہ کوششیں بار بار ہوئیں اور جولائی ۱۹۵۵ء میں وہ رہا کر دیے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حکومت پاکستان نے ان پر واضح کر دیا کہ آپ اس ملک میں رہنا آزاد

نہیں رہ سکتے، آپ کی جگہ کال کوٹھری کی مسلاخوں کے نیچے ہوگی۔ ہاں، اگر چاہیں، تو آپ کہیں باہر جاسکتے ہیں۔ اس پر وہ اگست ۱۹۵۵ء میں ہندوستان پہلے آئے۔ وہ جاتے وقت بھوی سے یہ کہہ کر گئے تھے کہ سال بھر میں واپس آجاؤں گا؛ لیکن انہیں واپس آنے آتے آتے سات برس سے زیادہ لگ گئے۔

پاکستان کے چار سالہ دورِ قید و بند میں انہوں نے دو کتابیں لکھیں۔ اول، تحریکِ ترقی ہندو مصنفین کی تاریخ "روشنائی" کے عنوان سے۔ یہ بعد کو دئی سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ دوسری کتاب فارسی کے مشہور شاعر حافظ کا تنقیدی مطالعہ ہے، جسے انہیں ترقی اُردو نے "ذکرِ حافظ" کے نام سے شائع کیا تھا۔ قید کے زمانے میں انہوں نے جو خط اپنی بیوی کو لکھے تھے، وہ بھی "خلوہ زندان" کے عنوان سے ایک مجموعے میں چھپ چکے ہیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے شعر گوئی بھی شروع کی۔ دراصل ان کا یہ کلام شعری معروف تعریف کی ذیل میں نہیں آتا۔ یہ ایک طرح کی نثری نظم ہے۔ بہر حال اس پر تنقید کا یہ محل نہیں۔ ان کی یہ سب چیزیں "بگھلا نیلم" کے نام سے چھپ چکی ہیں۔ ان کا ایک اور کتابچہ "ہندی ہندوستانی" بھی ہے جس میں زبانِ پرکٹ کی گئی ہے۔

آنے کو وہ ہندوستان آتے آئے، لیکن اصلی شکل یہ تھی کہ وہ پاکستانی شہری تھے، اور اس حیثیت سے وہ زیادہ عرصے تک یہاں رہ نہیں سکتے تھے۔ اُردو پاکستانی انہیں آزادی سے اپنے وہاں رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ غرض عجیب موقع کا سامنا تھا۔ سچا و ظہیر اس مذہب صورتِ حال سے پریشان تھے۔ بارے یہ مسئلہ وزیرِ اعظم پٹیل جواہر لال نہرو کی ذاتی مداخلت اور سفارش پر طے ہوا، انہیں ہندوستانی پاسپورٹ مل گیا اور حکومت نے انہیں ہندوستانی شہری تسلیم کر لیا۔

۱۹۵۸ء میں "عوامی دور" کے مدیرین کروہ لنگھنڈو سے دئی آگئے۔ پھر جب نومبر ۱۹۶۲ء میں کمیونسٹ پارٹی نے دئی سے ہفتہ وار "حیات" جاری کیا، تو وہ اس کے ایڈیٹر بن گئے۔ اس کے بعد ان کا مستقل قیام یہیں رہا اور وہ یہاں کی ادبی اور ثقافتی

زندگی میں بہت نمایاں حصہ لینے لگے۔

۱۹۷۲ء میں انھوں نے روس، جرمنی اور انگلستان کا طویل دورہ کیا۔ وہ وہاں کے کتابخانوں میں امیر خسرو کے کلام نظم و نثر کے خطی نسخوں کا کھوج کرتے رہے، جن کا جشن روس اور ہندستان کے اشتراک سے ۴۷ء ۱۹۷۳ء میں منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ۱۹۷۳ء میں وہ پھر انگلستان گئے۔ وہاں سے انھیں افریقی، ایشیائی، معتقدین کی کانفرنس میں شرکت کے لیے قزاقستان (روس) کی راجدھانی، الما آتا، جانا پڑا۔ لندن میں ان کی بڑی صاحبزادی نجمہ اپنے شوہر (علی باقر) کے ساتھ رہتی ہیں اور انھیں کے وہاں مقیم رہے۔

لندن سے وہ اگست کے آخر میں روانہ ہوئے اور چندے اسٹو میں قیام کرنے کے بعد الما آتا پہنچ گئے۔ مجوزہ کانفرنس ۲۷ سے ۲۸ ستمبر تک ہونے والی تھی۔ ۲۸ ستمبر صبح کے ناشتے پر بیٹھے تھے کہ ان پر دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر آیا، اس نے آرام کا مشورہ دیا۔ اگرچہ انھوں نے تکلیف کا دلیری سے اظہار کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے ساری عمر جس محنت سے کام کیا تھا، اس سے ان کا دل بہت کمزور ہو چکا تھا۔ نقاہت بتدریج بڑھتی گئی۔ ۱ ستمبر کی صبح وہ بیہوش ہو گئے، اور پھر آخری لمحے تک ہوش میں نہیں آئے۔ اسی حالت میں صبح ۳ ستمبر ۱۹۷۳ء صبح کے ساڑھے گیارہ بجے روح نفیس منھری سے پرواز کر گئی۔ جسدِ غاکِ ہفتہ ۵ ستمبر صبح کے وقت ہوائی جہاز سے نئی دہلی پہنچا اور انھیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان 'جامعہ نگر' میں خاک و آبِ ابدی نصیب ہوئی۔

اب قدرت کی ستم نظریضی کا انسا نہ سہیے۔ ان کے آخری قیام لندن کے دوران میں ایک دن کسی دوست کے ہاں ڈنر پر ایک امریکی مہمان نے اُن سے پوچھا، آپ کو بہت قزاقستان کے باہر کونسا ملک یا قہر سب سے زیادہ پسند ہے، یقیناً یورپ کی کوئی جگہ ہوگی؟ سمجھا تو پھر نے جواب میں کہا، نہیں، بلکہ مجھے روس کے ایشیائی علاقے اور ان میں بھی خاص طور پر قزاقستان کا خط سب سے زیادہ پسند ہے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ مشکل سے دو ہفتے

بعد ان کی تفریقستان کے دارالخلافے الہا آباد میں وفات پونے والی ہے۔
 مضافہ بات بھی دلچسپی سے غالی نہیں ہوگی کہ ”الہا“ کے معنی ہیں سیب اور ”آباد“ کے
 باپ (اتا ترک میں بھی اتا انھیں معنوں میں ہے، جو مصطفیٰ کمال پانڈا کے لیے بولا
 جاتا ہے)۔ تفریقستان میں سیب بہت کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی بلامبالغہ
 سیکنڈروں قسبیں ہیں۔ ریاست کی ساری صنعت و حرفت اور ایک طرح سے پوری
 زندگی کا محور ”سیب“ ہی ہے۔ اسی لیے یہاں کے لوگوں نے اپنے دارالخلافہ کا نام ہی
 ”الہا آباد“ رکھ دیا ہے۔

ولایت سے واپسی کے دو برس بعد، ستمبر ۱۸۳۷ء کو ان کی شادی سید رفیع حسین
 پرنسپل اسلامیہ کالج، امیر کی صاحبزادی رضیہ سے ہوئی تھی۔ یہ اس وقت بی اسے
 تھیں۔ بعد کو جب خاندان کا تمام الزام ادا ہو گیا، تو انھوں نے ۱۸۴۱ء میں الزام ادا
 لے کر سٹی سے ایم اے (اردو) کا امتحان پاس کر لیا۔ جب سجاد ظہیر ”نوی جنگ“ کے
 ایڈیٹر کی حیثیت سے کبھی میں مقیم تھے، تو رضیہ نے مدرسہ کی طرف منگ حاصل کی اور
 وہیں رحمت اللہ کرم سہاٹی اسکو لیا گیا اور وہ پڑھانے پر مقرر ہو گئیں، یہاں انھوں
 نے ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۵ء تک تین برس کام کیا تھا۔ جب خاندان نکھنڈ واپس آیا تو
 ۱۸۴۸ء میں وہ وہاں کرامت حسین گریس کالج میں پڑھانے لگیں۔ وہ وہاں ۱۸۴۵ء
 تک رہیں، اور اس کے بعد پتھوں سمیت دلی چلی آئیں۔ اولاد میں چار بیٹیاں ہیں،
 ہمنہ، نسیم، نادرہ، نور۔ وہ رضیہ سجاد ظہیر کے نام سے افسانے کے میدان میں شہور
 معروف ہیں۔ وہ جب سے دلی آئی ہیں، یعنی ۱۸۴۵ء سے، سوویت دس اخبار میں
 مترجم کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔

سجاد ظہیر اپنے احباب میں ”بے بھائی“ کے عرف سے مشہور تھے۔ سب انھیں اسی
 نام سے خطاب کرتے تھے۔ لیکن شاید ہی کسی کو اس عرف کی بنیاد معلوم ہو۔ جے یکریوٹی
 میں، عام رواج ہے کہ ان میں اپنے بچوں کو ان کے بچپن کے زمانے میں لائڈ پیا ر سے
 کسی نام عرف سے پکارتی ہیں۔ ان کے خاندان میں عرف یہ تھے، علی ظہیر، علی حسن، علی

لکن حسین ظہیر، متقی، سجاد ظہیر، یحییٰ، باقر ظہیر، یحییٰ، سید والدہ آگے بڑھیں، تو انہیں علی الترتیب غلے، لٹے، جھٹے، بٹے، تھپے پکارے گئیں۔ تو یہ ہے بنیاد پختہ مہائی کی۔

مردم ہماری گنگا جمنی تہذیب کا بے نظیر نمونہ تھے۔ ٹھیکیں و دوغار، سنجیدگی، انگولی اور رکھ رکھاؤ ان کی فطرت اور کردار کے اجزائے ترکیبی تھے۔ میں نے برسوں کی ملاقات میں کبھی ان کے سفر سے کسی کے خلاف کوئی کلمہ نہیں سنا، گویا وہ کسی سے ناراض ہونا جانتے ہی نہیں تھے۔

انہوں نے کچھ بہت زیادہ نہیں لکھا، اور ممکن ہے کہ جو کچھ لکھا ہے، وہ کبھی تاریخ ادبِ اردو میں کوئی وسیع جگہ نہ پاسکے۔ لیکن ان کا ایک کارنامہ ایسا ہے، جسے کوئی مؤرخ زبانِ اردو نظر انداز نہیں کر سکتا، اور یہ ہے، ترقی پسند ادب کی تحریک۔ اس کی تاسیس، ترتیب، تشکیل میں جو ردی انہوں نے ادا کیا اور اسے پروان چڑھانے میں انہوں نے جن غیر ملکی ملاحقین کا مظاہرہ کیا، وہ کوئی شخص ٹھہلا نہیں سکتا۔

اردو ادب میں درحقیقت چار تحریکیں ایسی ہوئی ہیں، جن کے اثرات بہت وسیع رہے ہیں بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اول، فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی تحریک، جس کے نتیجے میں اردو شکر کو پہلی مرتبہ اپنی زندگی اور قوت کا احساس ہوا، گلکرسٹ اس کی روح رواں تھے۔ دوسری، دلی کالج کی تحریک جو بوٹرو اور اشرنگر کے انہوں نام ترقی پسند تھی۔ اس میں تراجیم و تصانیف کے ذریعے زبان کا ماحول مالا مال ہوا۔ تیسری، سرسید اسکول کی تحریک۔ اس میں زبان کی تصنیفی صلاحیتیں ابھرنے پر سے عروج تک پہنچ گئیں۔ اس کی تصنیف و تالیف نے اردو کو عالمی زبانوں کے مقابلے میں لاکھڑا کیا۔ اور چوتھی تحریک، یہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے، جو ۱۹۲۶ء میں سجاد ظہیر کی بدولت وجود میں آئی۔ اس نے اردو کو نظم و نثر کو نیا رخ دے دیا جو لوگ اس سے وابستہ تھے، انہیں تو اس کے مقاصد کو سامنے رکھنا ہی چاہیے تھا، لیکن جو ادب اس سے باقاعدہ منسلک نہیں ہوئے، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ اس کے

بعد ازاں کی تخلیقات بھی نیا رنگ اختیار کئیں۔
ایسی ہمد آفریں شخصیت کو بھلا کوئی کھلا سکتا ہے!
اب ان کے چند شعر سنئے:

دریا

آؤ میرے پاس آؤ نزدیک

یہاں سے دیکھیں

اس کھڑکی سے باہر

نیچے اک دریا بہتا ہے

دھندلی دھندلی ہتی تصویروں کا

غامرشی سے بوجھل

زخمی سایوں میں

تیر چھپائے تھر تھراتے، بھٹے

کناروں کے پہلو میں

بیکل، دکھی

اے بھی نیند نہیں آتی

محبت کی موت

تم نے محبت کو مرنے دیکھا ہے

جھکی ہستی آنکھیں پتھر جاتی ہیں

دل کے دالانوں میں پریشاں گرم کو کے جھٹکتے ہیں

گلابی احساس کے بہتے سولے خشک

اور لگتا ہے جیسے

کسی ہری بھری کھیتی پر پالا

پڑھائے!

لیکن، یارب!

کر دو کہ ان سر جھائے سو کے پھولوں

ان غم شدہ جنتوں سے،

کیسی صندلی

دل آویز

غرض ہو میں آتی ہیں

تعزیت

شجرِ زیت سے ایک اور سر توڑ لیا
اس پہ شجوں کیا، وہ گل تر توڑ لیا
دستِ پیدا دلے تا بندہ گھر توڑ لیا

قلم کے پنجہ سوس نے بڑھنے بڑھتے
میں کی تابش سے پہنچتی تھی دونوں کو ٹھنک
سیدہ لطف و کرم جس سے منور تھا وہی

اس میں اک بعلِ غزلِ فحلہ ٹنگن ہے کہ نہیں
تیر غرضِ آب سے ہر، دل کی لگن ہے کہ نہیں
عربِ انسان کی مفرد شکن ہے کہ نہیں

لیکن اے دوست! زرا اپنے خزیے کو توڑ کر
اس میں کچھ غزلِ شہیدان کی جھلک ہے ایسے
تو جہیں رنج سے داماندہ ہے، لیکن اُس پر

جذب عالیپوری، راگھوندر راؤ

۳۰ اپریل ۱۸۸۹ء کو گنگا دتی (ضلع راہٹور، کرناٹک) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت رام راؤ تھے۔ لیکن یہ بعض دو سال کے تھے کہ عالیپور (ضلع محبوب نگر تلنگانہ، آندھرا پردیش) کی ایک محفل اور صاحب جاوادر بہمن ہوں شریکینی سیتا بانی نے انہیں گورے لیا۔ اس کے بعد ان کا اپنے اصلی خاندان سے سلسلہ ٹوٹ گیا، اور وہ نئے خاندان کے چشم و چراغ بن گئے۔

ان کی تعلیم اچھے غامے اہتام سے ہوئی تھی اور وہ ہفت زبان تھے۔ ملگو تو گویا ان کی مادری زبان تھی۔ کٹری اپنے چچا پنڈت ادھوراؤ وکیل سے، اور اردو فارسی پنڈت رام نرسو سے پڑھی۔ سید مخدوم حسین عرف خواجہ پیراں عربی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اسی طرح سنسکرت اور ہندی کی تعلیم کے لیے ایک پنڈت رکھے گئے تھے (افسوس کہ ان کا نام نہیں معلوم ہو سکا) بچپا کی تقلید میں انھوں نے بھی دکالت کا پیشہ اختیار کرنا پسند کیا چنانچہ جوڈیشنل استحقاق (اردو) میں بیٹھے اور دکالت کی سند حاصل کی۔ تقریباً پندرہ برس تک کامیابی سے دکالت کی۔ لیکن اس زمانے میں دن رات کی محنت سے ان کی صحت کچھ ایسی بگڑ گئی کہ انھیں باؤل ناخواستہ اس پیشے سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد انھوں نے کبھی کوئی کام نہیں کیا اور اپنے آپ کو ہمہ تن شہر و ادب کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب ریاست حیدرآباد کا الحاق ہوا، تو وہ عالیپور سے نقل مکان کر کے حیدرآباد چلے آئے، اور مستقلہ یہیں کی سکونت اختیار کر لی۔

انہوں نے شعر گوئی ۱۶ برس کی عمر میں شروع کی۔ یہ وہ زمانہ ہے، جب احمد حسن شوکت میرٹھی (ف ۲۶/۱۹۳۲ء) کا بڑا غفلہ تھا، وہ اپنے آپ کو مجددِ واسنہ شریف کہتے تھے اور ان کے دورِ سائے پر وائے "اور شمسہ ہند" ان کے "تجدد" کی تبلیغ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا رہے تھے۔ جذبہ نے بھی اپنے کلام پر اصلاح کے لیے شوکت کا انتخاب کیا۔ غالباً چندے غلام محمد خٹک ترک علی شاہ ترکی (ف ۱۰ مارچ ۱۹۱۹ء) سے بھی مشورہ رہا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سید نظیر حسن سخا دلوی (ف فروری ۱۶/۱۹۳۳ء) سے بھی استفادہ کیا، خاص طور پر عروض میں ان سے مشورہ کرتے رہے۔ ان دونوں حضرات کے انتقال کے بعد مجددِ آپاد کے مشہور رباعی گوشا حضرت امجد صلیح امجد (ف مارچ ۱۹۶۱ء) اور جگر بریلوی سے رجوع کیا۔

جب تک عالمیور میں قیام رہا، ان کی ذات مرکزِ شعر و ادب بنی رہی۔ انہوں نے یہاں "بزمِ نہالی" سمیٹی "قائم کی تھی۔ اس کے ۱۱ جلسوں کی یہ خصوصیت تھی کہ غزل اور نظم کے علاوہ اس میں نثری مضامین بھی پڑھے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان جلسوں کی شہرت و دورِ دور تک پہنچی، اور باہر کے شاعر اور ادیب بھی ان میں شامل ہونے لگے۔ ان شاعروں سے جہاں ریاستِ حیدرآباد کے دورِ دست خطوں میں اردو کی ترویج ہوئی، وہیں خود ان کا نام بھی ساری ریاست میں شاعر اور محبتِ اردو کی حیثیت سے لوگوں میں مشہور ہو گیا۔

انہوں نے اتنی برس کے قریب عمر پائی۔ آخر تک مندرستی ضعیف رہی، اکوڑی جسمانی عارضہ بھی لاحق نہیں تھا۔ لیکن کبرستی کے باعث گزردہ برہمنی جا رہی تھی۔ اسی میں ۲۷ ستمبر ۱۹۷۳ء کی درمیانی شب کے ڈھالی تین بجے (یعنی ۲۸ ستمبر کے ابتدائی وقت میں) دُورِ آفس غمیری سے پرواز کر گئی۔ اولاد میں ایک بیٹا آخری ہر ہلا دروازہ اور تین صاحبزادیاں (بچہ دیوی، سہاگیتا عرف بیلا بانی، راجتا عرف ششندا) اپنی یادگار چھوڑیں۔ شہری ہر طاوور ڈیپو سچل کارپوریشن، حیدرآباد میں ملازم ہیں۔

مذہب نے رباعی کے میدان میں خاصی شہرت حاصل کی، بلکہ آندھرا اردو مجلس کی طرف

سے انھیں "خاتم آندھرا" کا لقب بھی ملا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے رُبا می کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ سا بنو غزل بھی چھپ چکا ہے (حیدر آباد ۱۹۷۲ء) ان کے رباعیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے، رباعیات جذب، ارمغان جذب (۱۹۷۲ء)، جذب و صدا پاد (۱۹۷۳ء)، تحفہ جذب (۱۹۷۹ء)؛ آہنگ جذب (۱۹۷۵ء) آخر الذکر کے دو حصے ہیں: (۱) مساوات جذب اور معلومات جذب۔ ان کے منسکات، تلگو اور کشری کے منظوم تراجم اور ایک تشری تصنیف بھی شائع ہو چکی ہے (یعنی مستوی طبع ہونے سے رو بھی گئے۔ ان میں جنوبی ہند (مدراس و میسور) کے شعرا کا تقیم تذکرہ "غنائت کہن" زیادہ اہم ہے، جسے انھوں نے ۱۳۷۱ھ میں مکمل کیا تھا۔ (نام تاریخی

۱۴)

کلاسیکی انداز کا بہت عمدہ کلام ہے۔ تصوف کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ ہرگز زبان اور بیان کی سختگی ان کا ماہرہ الاتیان ہے۔ ان کی ادبی خدمات کے احراف میں حکومت ہند نے ٹریژر سور و سپر ماڈل ڈیفنڈ مقرر کیا تھا، جو ان کی وفات تک جاری رہا۔

اب ہندو شعرا غلط ہوں !

بر نفس کا بندہ ہے، وہ ناکام ہے کیوں؟	دنیا سے وفا میں نفس بدنام ہے کیوں؟
ہے نفس بھی تیری دین، ذول بھی کی طرح	پھر نفس نوازی کا یہ الزام ہے کیوں؟
بجہ ہائیکا اک روز چسرا بخ استی	اک روز از حجاب نیگا باغ ہستی
رٹ جائیکا، اسے ہند، اپراک نقش وورد	ڈھونڈے بھی دیکھا نہ سسرا بخ ہستی
ہام عشرت کو کبھی بھرنہ سکے	اور دور مصیبت میں کبھی مر نہ سکے
خوش بہت ہیں وہ جو نیکیاں کرتے ہیں	جی بھر کے ہم گنہ گہی کر نہ سکے
جو فلسفہ حیات کا دانا ہے	وہ رنج سے اور خوشی سے بے پردا ہو
میں رنج و خوشی صرف فریب ہستی	دنیا اپنی جگہ خود اک دھڑکا ہو
گذری ہے ہمیشہ اٹک پختے پختے	گذری ہے جگر کے زخم میں، پیٹے
امید و دنیا میں رہے ہم زمرہ	آرام ملا کبھی نہ پیٹے، پیٹے

یہ لم حشر و خواب ہم پر بھی تو تھا یہ سایہ آفتاب ہم پر بھی تو تھا
تھے ہم بھی روتی عالم لے جذبہ بنا مجھ وہم سا ہے شباب ہم پر بھی تو تھا
غائبی میں انداز اثر پیدا کر جو کمر سے خالی ہو، وہ سر پیدا کر
ہزارہ من کائنات پر مشیدہ ہے سب کچھ نظر آئیگا، نظر پیدا کر
انحال گزشتہ کو بھی یاد نہ کر مستقبل کے لیے بھی فریاد نہ کر
جو کچھ کہہ لیا، ہوا، جو ہو گا، ہو گا تو فکر میں اپنی عمر برباد نہ کر
وہ جو جس طبیعت اور روانی نہ رہی وہ حرم وصال، وہ کاروانی نہ رہی
تھا مجھ پر! شباب اک جہان امید جب وہ نہ رہا، تو زندگی نہ رہی
ہے خالق کو ایک مانا میں نے جہان تحقیق میں زمانا میں نے
کہا تو یہی کہ کچھ نہ سمجھا لے جذبہ! جہان تو یہی کہ کچھ نہ جانا میں نے
دل آئینہ نہ بھلا کہاں ہوتا ہے بے سنی بھی کوئی کامراں ہوتا ہے
گھٹتی ہے سیاحت سے کدورت دل کی پانی ہے وہ پاک جہدِ دال ہوتا ہے

معتوق و مشرب دم کنارا مد بھی ہیں پاپسند جو س سیاہ کار آمد بھی ہیں
مجھ پر ہی فقط عتاب تیرا کیوں ہے؟ میری ہی طرح گناہ گار اور بھی ہیں
کس سمت ہے جلوہ گاہ معلوم نہیں کب تک بھٹے نکلا، معلوم نہیں
خود آئے، دوست اپنائی کر لے مجھ کو ترے گھر کی راہ معلوم نہیں
کہیں ہے اب رہا رہ گھٹن نہیں ہے شبنم، جہیں ہیں آنسو

بزار ہر دوں میں رنگ و بو کے برس رہا ہے شباب توڑا

اگر کفر ہی ہو، بنا عشق کی ہے تو کافر ہے پھر عسکران ہو گا

ارے دوست، جہوں کی یہ مدداری کہاں تک سلسلے پر ہیں کا

ہر سہ اعتبار و تقیسا، رہتا ہے اب دنیا میں اعتبار کسی کا کہاں ہے اب!

جذبہ! چل راہِ جنت میں جہدِ دل لے جائے راہِ جہنم سے نہ آئی کسی رنگیر سے کر

لو با غاہوں، تجھ کو خبر بھی نہیں ہوئی بیتا ہوں بھر بھی نام تیرا بار بار دہن

مجھے مطلب ہے سجدہ کرنے سے بُت ہے یا وہ خدا، نہیں معلوم

بڑی مشکل سے ہم لائے گئے تھے تیری محفل میں

مگر محفل سے اٹھ جانے کا پھر ارمان ہے دل میں

سجدہ دل کا شغل، اے دل سودا نشانِ بے چوڑ سرا ہے ساتھ چھوڑ دے، تو آستانِ بے چوڑ

آنکھوں میں آگیا ہے مٹ کر جہانِ دل میری نگاہ دیکھ، مرا مدد صاف پوچھ

وہ آئے تادور چلے گئے بزمِ خیال سے اتنی ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا نہ ہو چھ

ہر تنہا ہے جاوے منزل میں راہِ زن چا ہے کب تک ہی جائے، مگر داستانِ بد چھ

مر رہے ہیں، مگر نہیں مرنے واہ کیا زخمی ہماری ہے

میری نظروں کی خبر و سلامی تیرے جلوں کی پاسداری ہے

دل تھا رہا ہے، میری چیز نہیں جان میری نہیں، تمھاری ہے

جا گئے ہیں بھول، جگنو، برگ و بار آج تقدیرِ بچن بیدار ہے

ہے یہ طوفاں صرف تاحدِ محمود دل میں لہرائشی تو بیڑا پار ہے

کر لیا اقرار میں نے آپ کا اب مجھے ہر چیز سے انکار ہے

یہ تیرا یہ خسرِ ہم حسن، تو بہ! وہ چلتے ہیں کڑتے ہیں ہوا سے

بس اک سادہ تلک ہی ہے دلِ ناکارہ کی قیمت

زیادہ ہو، تو پھر جو کچھ سزا جی بار میں آئے

مشق کی لذت نہ پوچھو اے ہفتیش! مشق، بس اک لذتِ بے نام ہے

اقترب رآبادی، سردار بیگم

۹ مارچ ۱۹۱۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کی نواب اعظم یار جنگ جہان خان علی سے کچھ عزیز واری تھی، لیکن میں ششہ مستقیم کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ ان کے والد سید امیر حسن تھے اور دادا سید کریم حسن نرنکھنوی۔ نرسہ کہتے تھے اور داغ کے شاگرد تھے۔ اصل میں یہ خاندان نکھنوی تھا۔ لیکن اودھ کے الہاٹی کے بعد ان کے آبا و اجداد ترکہ وطن پر مجبور ہوئے اور حیدرآباد میں بس گئے۔ جب سے یہ لوگ عزت و اکبر سے ہیں بسر کر رہے ہیں۔

سید امیر حسن کا ۱۹۲۲ء میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سردار بیگم کی پرورش اور تعلیم تربیت کا بار ان کے چچا محبوب علی صاحب کے کندھوں پر آ پڑا۔ انھوں نے ابتدا میں کچھ نٹوڑا بہت گھر پر پڑھا؛ اس کے بعد محبوب بیگم سرس اکھل، حیدرآباد میں تعلیم پائی۔ بہت جلد خان صاحب عبدالغنی رئیس نصیر آباد چھاؤنی (راجستھان) سے شادی ہو گئی، جو قوتج میں ٹھیکہ داری کرتے تھے؛ اور اسی سلسلے میں کانپور میں حکومت پذیر تھے۔

سردار بیگم کے مزاج میں شروع سے ولولہ اور سیما تیت تھی۔ یہ سیاسی لمجھل کا زمانہ تھا چنانچہ وہ کچھ ان سرگرمیوں میں حصہ لیے، لگئیں۔ اولاً علامہ عنایت اللہ خان مشرقی (ف، اگست ۱۹۶۳ء) کی خاکسار تحریک میں اور بعد کو مسلم لیگ کے دور میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ خان صاحب عبدالغنی منولی آدمی تھے؛ سردار بیگم کی ذاتی ملکیت، ایک سنیما گھر (برقی تھیٹر) بھی تھا، غرض مالی پہلو سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ لہذا سماجی اور سیاسی ذوق کی تسکین ان کے لیے آسان تھی۔ انھوں

نے مشرق بعید کا سفر بھی کیا تھا۔ بعد کو جب عبدالغنی صاحب نے بنگلور میں مستقل سکونت اختیار کی، تو سرور و بیگم بھی ان کے ساتھ رہیں بنیم ہو گئیں۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو بنگلور ہی میں رحلت ہوئی؛ اپنے سکونت کے بنگلے (استور) میں دفن ہوئیں جیسائی یا دگا صرف ایک لڑکا عثمان غنی (حرف متا) جموڑا۔

ان کی دوکتا میں چھپ چکی ہیں پہلی ”صوفیہ درخشاں“ کے مزار سے، اس میں تعقیب کلام ہے: دوسری تعقیب اقبالؒ جس میں اقبال کی بعض نظموں کی تعین کی ہے۔ اب چند شعر بطور نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

سنگاپور میں ایک مسلم دوشیزہ کو محو رقص دیکھ کر

فطرتِ انسانیت، آہ یہ تیسرا دواں	مسن کی عریانیوں، باعثِ فساد و کمال
آہ، وریعت ہوا الجھو کو ترا عہدِ حال	کاش کے ملتا مجھے جملوۂ سامنی ترا
آہی گیا آخر غرضِ شینہٴ ہستی میں ہال	سنگِ خرد بارِ عقل، ہو ہی گیا کامیاب
گردنِ اخلاق پر شجرِ تہذیبِ جال	کتنی، داؤں کے ساتھ، آج ہے محو خرام
کل کو جو شے تھی حرام، آج وہ شے بے طال	جلوۂ انفرنگ کی، آہ! یہ افسوں گری
عشق نہیں عشقِ کامر ہے اک اختلال	عُشس کہاں عُشسِ کامر ہے وہم و فریب
پست ہے ذوقِ نظرِ مردہ ہے ذوقِ حال	عُشس میں ہے اب کہناں دگشی و زندگی
ایک نگاہِ بوسسِ قیمتِ ستار و حال	عشق کو افسوس ہے مسن کی تقدیر پر
اب نہ سرورِ نیاز، اب نہ فنانِ بلال	سازیم ذوقِ میں، بر لبِ پُرشوخی میں
ہوش میں آ، ہوش میں تیرا نہیں یہ کمال	پی کے سے مرنی، آند بہت جوش میں

چشمِ بصیرت مری دیکھ چکی آہ، آہ!

موت سے پہلے ترا سانچہ ارحمال

عالم رنگ و نغمہ میں کیف بہت ہی، مگر
ان کی بھی آنکھ ہو گئی جوشِ الم سے آگے تر
بخود سیر کا ثبات، اپنی طرف بھی لک نظر
میں نے اٹھائی کون نگاہِ عالم درد میں ادھر

یوں نیکو مسکے گا تو ان کی حرم ناز میں عشق کی تیغ تیزے قتل سے پہلے جنگ کر
شکل میں دکھائے جا پڑو درمیاں اٹھا شوق مرا ہے پارسا عشق مرا ہے مستبر
یری تیز شوق کو ایک زسانہ جا ہے تیرا ہوا بھی ہے مرد میری فوا ہے گرم تر
آہ شراب شوق کا کیف بہت عجیب ہے وہ ہیں کہ مجھ سے بے نیاز اور میں ان سے بجز

تیری فغان نے کر دیا سینہ گل کو چاک چاک

اختر خوش نوا افروش، اختر خوش نوا اشہر

کسی گھوٹے ہوئے کی جستجو کیا کسی پھڑے ہوئے کی آرزو کیا
ترے رُخسارِ زنجیں کے مقابل گل دگلزار میں ہے رنگ و بو کیا
خازنِ عاشقان میں سے عزیزو! تیرم کس کو کہتے ہیں، و منو کیا
نہ آئے آج تک، تو روزِ محشر وہ آئیں گے ہمارے رو برو کیا

ہینچھاؤں مشہر لولاک کے پاس

مری ہے اور اختر آرزو کیا!

بہتم ہی بہتم ہے جوان ہی جوانی ہے۔

خدا رکھے بخت حاصلِ مددِ مگان ہے

کیا پوچھتے ہو عشق کی افتادِ کامل غامض بھی رہنے میں ہے فریادِ کامل
ہر سانس میں ہے شبن پُر آشوب کا پیغام ہر گام پہ ہے عشقِ مستم زادِ کامل
آفت کے آئینِ بخت! لب لاسکتے نہیں ناز کر سکتے نہیں، اندر سنا سکتے نہیں
واہ سے جذبِ بخت! اُن کے مجور کی سنا سہول جانے پر بھی وہ مجھ کو سہلا سکتے نہیں
نظر ہے بس یہ اختر! شرحِ آدابِ وفا آگ سی دل میں لگی ہے اور بچھا سکتے نہیں
جن سے ہوا استقامتِ سینہ عالم گداز مجھ کو سنا دیجیے، پھر وہ نواہائے راز
ذوقِ طلب ہے تو پھر خود دنیاں سے گزر راہِ وقایں ذکرِ نیکو نشیب و فراز

آہی گئی آج نیند، سنب و برہا رہر

بمخودی آرزو، عمرِ ہر تیسری دراز!

بحر و محبوب، راجا محمد امیر احمد خان (والی محمود آباد)

راجا محمد امیر احمد خان (والی محمود آباد) کے اجداد میں ایک صاحب نعر اللہ جو بغداد میں عہدہ قضاۃ پر فائز تھے، ہارویں صدی میں ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے؛ یہاں بھی ان کی زمین نسلیں دلی میں اسی عہدے پر شگن رہیں۔ ۱۲۴۵ء میں خاندان کے ایک فرد قاضی نصرت اللہ عرف شیخ نقیہ کو محمد بن تعلق نے ضلع ہارویں کے سرکش قبیلے "بھار" کی سرکوبی کا حکم دیا، اور ان کی کامیابی پر انہیں جاگیر عطا کی۔ ایک دوسرے فرد داؤد خان نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔ انہیں کے بیٹے محمود خان نے محمود آباد بسا دیا تھا۔

مغلوں کے بعد اور دہ کے شاہی زمانے میں بھی ان کا اقتدار اور جاہ و ملال قائم رہا۔ ۱۸۵۰ء میں شاہ اور دہ نے خاندان کے سربراہ نواب علی خان کو راجا کا خطاب عطا کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں راجا نواب علی خان نے بھی سرگرم حصہ لیا تھا، لیکن آخر کار انہیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے محمد امیر حسن خان نے رفاہ و حاتمہ کے کاموں میں خاص طور پر بہت حصہ لیا۔ انگریزوں نے ان کا شاہی خطاب تسلیم کر لیا، بلکہ اپنی طرف سے اس پر H.C.I.E کا اضافہ کر دیا۔ ان کی وفات (۱۹۰۳ء) پر ان کے بیٹے صاحبزادے راجا محمد علی محمد خان ان کے جانشین ہوئے۔ انگریزوں نے انہیں ذاتی خطاب ہمارا ہمارے نوازا تھا۔ ہمارا راجا محمد علی محمد خان اپنے زمانے کی مشہور شخصیت تھے۔ اس عہد کی بیشتر تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا۔ وہ مجلسِ راجسہ تو انہیں کے رکن بھی رہے تھے۔

مردم راجا محمد امیر احمد خان انھیں مہاراجا محمد علی محمد خان کے بیٹے صاحبزادے اور جانشین تھے۔ ان کے نانا سید فیاض حسین کنٹوری تھے۔ جن کا سلسلہ نسب امام ہفتم حضرت موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے ملتا ہے۔ راجا محمد امیر احمد خان جمعرات ۱۵ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ نومبر ۱۹۱۴ء کو محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ سن شعور کو پہنچے تو تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے مولانا سید ظفر محمدی گہڑ مقرر ہوئے۔ عزیز کنٹوری پہلے سے بحیثیت کتا ہدار ریاست کی ملازمت سے منسلک تھے اور اردو زبان و ادب کے درس کے ذمہ دار قرار پائے۔ اسی طرح انگریزی پڑھانے پر بھی ایک استاد مقرر ہوئے۔ جب چند برس میں یہ مراحل بحسن و خوبی طے ہو گئے، تو کنٹوری کے مشہور لائبریریئر کاچ سے سینئر کیمبرج کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے برادر خورد مہاراجا جگمار امیر مدد خان کے ساتھ مزید تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے گئے، لیکن اسی دوران میں ان کے والد مہاراجا محمد علی محمد خان بہادر کا انتقال ہو گیا، اور انھیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔ البتہ چھوٹے مہاراجا جگمار وہیں رہے اور انھوں نے پیرسٹری کی سند حاصل کی۔

چونکہ دونوں بھائی کھن تھے، اس لیے ان کی صغریٰ کے زمانے میں ریاست کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے مہاراجا محمد علی محمد خان مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے ایک مجلس اُمناء اور ڈائن ٹرسٹیز کی تشکیل کی تھی جس کے اراکین مسٹر محمد علی جناح، سردار حسن، مہاراجا درشاہ اور ڈپٹی سید علیہ اللہ تھے۔ اس مجلس نے راجا امیر احمد خان کے بالغ ہونے تک محمود آباد کے نظم و نسق کی نگرانی کی۔

راجا امیر احمد خان کو ۱۹۳۶ء میں پورے اختیارات عطا ہوئے۔ یہ ہندوستان کی سیاست کا بڑا ہنگامہ بن گیا اور فیصلہ کن دور تھا۔ لیکن یہ مجلس اُمناء کے اراکین کے نقطہ خیال کا بھی کچھ اثر رہا ہو، بہر حال راجہ صاحب موصوف مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس کنٹوری میں ہوا تھا، اس کا سارا انتظام بھی انھیں نے کیا تھا اور اس کے جملہ اخراجات (دولاکھ روپیہ) بھی خود برداشت کیے تھے۔ اس

کے بعد وہ مدتوں مسلم لیگ کے خازن رہے اور رفتہ رفتہ اس کے صفِ اوّل کے کارکن کی حیثیت سے انھوں نے بہت نام پیدا کیا۔

۱۹۴۶ء سے ۱۹۶۷ء تک کے گیارہ برس میں وہ ملکی سیاست کے مرکز میں رہے۔ اس دور میں ان کی ملاقات بعض سیاسی لیڈروں سے ہوئی، جن میں پی، سی جوشی اور سید تجا دلیر نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان اصحاب کی ترغیب پر انھوں نے کمیونسٹ لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا۔ اپنی ٹھیٹ مذہبیت اور اسلام پر اہل اعتقاد کے باعث وہ کمیونسٹ تو بن نہیں سکتے تھے، لیکن بہر حال وہ اشتراکی خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ انھوں نے اشتراکیت کا فائر مطالعہ کیا، تو ان پر یہ حقیقت اور واضح ہو گئی کہ اسلام کا اقتصادی نظام کسی طرح اشتراکی طریقے سے کم منصفانہ نہیں۔ مگر یہ تو اس کی کہ اسے پورے پرنا فذر نہیں کیا جاتا۔ اس پر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس کا آغاز ریاست محمود آباد سے کیا جائے۔

انھوں نے حکم دیا کہ تمام زمین کی پوری جائیداد پڑتالی کی جائے، مزارعین کے نام اس قطعہ زمین کے گوشوارے میں درج ہوں، جسے وہ کاشت کرتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ پوری ریاست کی اٹاک ایک انجمن امدادِ باہمی (کوآپریٹو سوسائٹی) میں تبدیل کر دی جائیں، جس میں وہ خود اور ان کے تمام مزارع حصہ دار ہوں! اور سب کو حقِّ رسدی شافع میں شریک کیا جائے، لیکن بدلتے حالات کے باعث ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

۱۹۶۷ء میں آزادی آئی، ملک تقسیم ہوا، اور حالات نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر جائیں۔ لیکن تعدد کی ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ پاکستان میں بھی نہ رہ سکے جس کے قیام کے لیے انھوں نے ہر طرح کی قربانی دی تھی۔ چنانچہ دل برداشتہ ہو کر وہ بغداد (عراق) چلے گئے۔ چونکہ ان کے معتقدات کے تمام مراکز اسی ملک میں تھے، اس لیے یہاں کا قیام ان کے لیے تسکینِ روح و دماغ کا باعث ثابت ہوا۔ بسراوقات کے لیے انھوں نے تجارت کا سہلا لیا۔ شہر میں مشینوں کی اچھی خاصی وسیع دکان کھول

لی۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں یمن میں بغداد میں ہوئی۔
 راجا صاحب بوموف بھی کبھی پاکستان جاتے رہتے تھے۔ وہاں ان کی کمر سکنی جاوا دیکھی تھی، اس کی
 دیکھ بھال بھی ضروری تھی۔ اس کے علاوہ احباب کی بھی کمی نہیں تھی، ان سے ملنے۔ کئی مرتبہ
 ان سے وزارت میں شامل ہونے کی درخواست کی گئی۔ لیکن وہ حالات سے سمجھوتا نہ کر سکے
 اور انھوں نے ہر مرتبہ اس سے انکار کر دیا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان کی مالی
 حالت بہت کمزور ہو گئی تھی اور وہ اس پہلو سے فکر مند تھے۔ حسن اتفاق ہے اس کا
 ایک حل نکل آیا۔

۱۹۵۸ء (یا شاید ۱۹۵۹ء) میں دول العربیہ (عرب لیگ) نے فیصلہ کیا کہ لندن میں
 ایک اسلامی ثقافتی مرکز قائم کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے دس لاکھ پونڈ کا سرمایہ
 جمع کیا، جس کا بیشتر حصہ غالباً سعودی عرب اور کویت نے دیا تھا۔ حکومت پاکستان
 کا رویہ ہمدردانہ تھا، کچھ گفت و شنید کے بعد وہ شہر کے وسط (پارک روڈ ریمنٹ) میں
 ایک پرانی تاریخی عمارت مجوزہ مرکز کے لیے دیے پر آمادہ ہو گئی۔ چنانچہ دفتر کھل گیا
 اور اس کے پہلے مدیر ایک مصری صاحب (ذوکی عبدالقادر) مقرر ہوئے۔ ان کا تقریر
 تین سال کے لیے ہوا تھا۔ جب ۱۹۶۱ء میں ان کی یہ عادت ختم ہو گئی اور وہ قاہرہ واپس
 چلے گئے، تو قنصلی سی کوشش سے ان کی جگہ پر راجا صاحب بوموف کا تقریر
 ہو گیا۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک میں یمن میں مقیم رہا تھا۔ اس زمانے میں بار بار لندن جانے
 کا موقع ملا۔ اور چونکہ میرے ایک عزیز دوست وہاں اسی اسلامی مرکز میں عربی
 پڑھانے پر تعینات تھے، اس لیے اکثر وہاں جاتا، بول راجا صاحب مرحوم سے بھی پیشہ
 ملاقات ہوتی رہی۔ میں آخری مرتبہ جون ۱۹۶۹ء میں یورپ اور لندن گیا، تو پھر
 حاضری مدت پورا۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔ ان کے لطف و کرم کی یاد میرا
 سر پایہ حیات ہے۔

چونکہ زندگی ہمدردانہ تھی، اور محنت کے حامی تھے، اس لیے صحت بالعموم ہمیشہ اچھی

ری، لیکن وقت موجود تو کسی کے نامے نہیں مل سکتا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو بمبئی ۱۴ رمضان ۱۳۹۳ھ کو دفعۃً فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ فوراً اسپتال پہنچائے گئے مگر علاج معالجے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ لیکن بیہوشی اس حالت میں دو دن بعد ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو صبح کے وقت اپنے خالق حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ ان کے خاندان کی خاص ہڑوا کر بلائے معلیٰ میں موجود ہے؛ نفیس کو وہیں دفن کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن انھیں آیام میں مغربی ایشیا میں عربوں اور اسرائیل کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور محفوظ اور آئیے آمد و رفت کا نقصان تھا۔ اس لیے طے ہوا کہ فی الحال لاش امام رضاؑ (علیہ السلام) میں سپرد کردی جائے بعد کو جب حالات سازگار ہوں اسے کربلائے معلیٰ منتقل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق لاش ۱۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو لندن سے تھران آئی، اور اسی دن شہید پہنچی، جہاں اسے قبرستان ”باغ رضوان“ میں سپرد کیا گیا۔

تعداد اصحاب نے تاریخ وفات کہی ہے۔ مزان نگار شاعر سید مبارک حسین ڈیوٹ نے جیسوی تاریخ کہی، غلطی میں غلطی و عالم دانی محمود آباد (۱۶۱۹ء) اور دھری میں ڈاکٹر اشاد علی کیف محمود آبادی کا پورا شعر ہے :

تکبر تاریخ مرگ کیا ہوگی کیف تمہیں نے دل کو توڑ دیا

”کیجے راجا امیر احمد نے بزم سستی کو آہ چھوڑ دیا“ (۱۳۹۳ء)

مرحوم کو ادب سے شرف اور شعر گوئی و رفتے میں ملی تھی۔ ان کے پردادا راجا نواب علی خان بہادر شعر کہتے تھے، اور اس میں غالباً آغا جو شرف لکھنوی کے شاگرد تھے۔ دادا راجا محمد امیر حسن خان بہادر مرثیہ کہتے تھے اور اس میں حبیب تخلص کرتے تھے؛ نزل میں ۱۱۰ کا تخلص سحر تھا۔ نفیس لکھنوی کے ساتھ ان کے دوستانہ تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ لیکن ہے، ان سے مشورہ بھی رہا ہو۔ مرحوم کے والد بہار راجا محمد علی محمد خان بہادر کا تخلص مرثیہ میں محبوب اور نزل میں ساحر تھا۔ اسی روایت کو راجا حسد امیر احمد خان نے جاری رکھا؛ مرثیہ میں اُن کا تخلص محبوب تھا اور نزل میں بحسب

کلام پر اصلاح میر علی محمد صاحب حارف سے لی۔

انہوں نے مرثیے میں مستحسن کی کلاسیکی ہیئت قائم رکھتے ہوئے اس میں نئے معانی اور
ہجاءات داخل کئے۔ مرثیہ پڑھنے میں خوب تھے اور اس میں بھی انہیں خاص امتیاز حاصل
تھا۔ نہ صرف محمود آباد ہی میں، بلکہ کبھی کبھی مختلف اصحاب کے امراء پر باہر بھی مجالس
میں پڑھنے میں تامل نہیں تھا۔ گاہے گاہے کئی صحبتوں میں سوز اور فوجہ بھی پڑھتے
تھے جن اصحاب نے انہیں پڑھنے سنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ وہ طالعہ الہ انیس کے
کامیاب غایندے تھے۔

انہوں نے کلام کا مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ صرف کچھ مرثیے اور سلام اور چند
غزلیں رسالوں میں چھپی ہیں۔ ایک مرثیے کے چند ابتدائی بند اور کچھ کلام جو بعض رسائل
سے جمع کیا گیا ہے، بطور نذرِ ناظرین ہے۔

مرثیہ

بہاں کے واسطے ہے وجہ زندگی پانی ہے چشم عالمِ افساد کی حسی پانی
رنگوں میں دہر کی دوڑا کبھی پانی اسی سے شکل الہی جہاں ہوئی پانی
بڑھے ہوئے ہیں اسی سے تپاک کے دامن

اسی نے رنگ دے مجھ خاک کے دامن

اسی سے پانی ہے روحِ حیات ہستی نے جھلک پڑے ہیں اسی سے نلک کے عین
اسی کے دم سے نشادہ بخار کے سبھنے اسی نے نصب کیے ہیں جہاں میں آجینے

زمانے بھر کے لیے وجہ زندگی پانی ہے

نلک کی آنکھ کا تارا زمیں کا پانی ہے

اسی کی وجہ سے آب و دُورِ دایہیات اسی سے گلشنِ بستی میں ہے بہارِ حیات
اسی کے دم سے ہے وابستہ اعتبارِ حیات یہی ہے جانِ حیات اور یہی دایہیات

ہے روح ہر حرکت کی اور ساکن کی

مداستو تو جین الما کُل شئی کی

خزاں کے زور اسی کی خود سے ٹوٹنے
 مڑے اسی سے ہمیں نے بہار کے موٹے
 اسی نے دامن گل پر بنائے گل بوٹے
 اسی کی جھٹ سے گلشن میں آجے پھوٹے
 اسی کی آب نے گوہر کو کر دیا پانی
 اسی نے گل کے کٹوروں میں بھر دیا پانی

اسی نے چاؤ خشکی زمین سے چسپیں ہے اس کی سادگوں میں غضب کی رنگینی
اسی نے گل کو سکھائی چمن میں رنگینی اسی کے قطروں میں نہاں ہے شبنم آئینی
سحابِ شر کو برسنا سکھا دیا اس نے
گلوں کو بارغ میں ہنسناسکھا دیا اس نے

دھو دلا لہ ولسرین ولسرین اس سے جہاں میں آتشِ گلزارِ فضلہ زین اس سے
 ہر کے رنگ میں ڈوبا ہوا چمن اس سے بنیرنگ ہے ہر خاکِ پامن اس سے
 اسی کے آب سے ردِ فنی بڑھی ہے گلشن میں
 اسی نے آگ لگا دی چمن کے دامن میں

سکھائیں پھولوں کو محرابوں کی ریاں اس نے
 شمیم گل کو دیں آوارہ گردیاں اس نے
 فزائن کے چہرے سے دھوئی ہیں زردیاں اچھے
 لباس باغ پہ کھولی ہیں فردیاں اس نے
 غلوں کے سہائیں میں نظاروں کے ڈھنگ بٹا ہیں
 خدا کی شان کو پانی نے رنگ بد سے میں

اسی کے جود سے پُر ہیں ہمارے آغوش
انڈیری مائیں ہیں، ہے حکمراں اسی کا فروش
زبانیں موموں کی چلنے لگی ہیں رخص بدوش
یہ سوز بانوں سے گویا ہے 'اور بھر خاموش
یہی وہ ہے کہیں ادبِ پنجا ہوا اگر سر سے
تو اس کے فیض سے کشتِ عمل میں کھنکھارے

فیوضِ پائے ہیں مسلم بھی اور کافر بھی ہے ایک طرح سے باطن بھی اور ظاہر بھی ہے وامن اس کا مظہر بھی اور ظاہر بھی مقیم بھی ہے مثالِ نظرِ مافسر بھی

نکاح و عقل میں رتبہ وسیع ہے اس کا

یہ بحر فیض ہے دامن وسیع ہے اس کا

وہ اپنا فضل و کرم صبح و شام کرتا ہے وہ اپنی نعمتیں یونہی تمام کرتا ہے

وہ نورِ آب سے اک فیض عام کرتا ہے وہ کسی چیزِ زول کی قیمت حرام کرتا ہے

خیال اُس کو ازل سے ہے نفعِ خلقت کا

اور آپ کچے ذریعہ ملاحظہ است کا

جہاں کے واسطے سقا بنیں یہیں نہسریں چلیں جہاں کی چوٹی سے، منجلی نہسریں

کریں فریضہ واجب میں کیوں گئی نہسریں زمیں پہ کھل گئیں، دوڑتی ہوئی نہسریں

خود اپنی موجوں سے ہونے لگیں لہام بکف

کوئی ہے تشنگِ بدوش، اور کوئی بام بکف

زمانہ کیسے ہو سیراب، کیسے نعمت پائے جو بستیوں میں رہے، اوج پر وہ کیونکر آئے

مہال کس کی جہز دیا کو آسمان پہ چڑھا ئے یہ کس میں تاب کر سکیں کو سیر کا رہا ئے

بحارِ حکم سے، دنپائے انقلاب بنے

پہننے آئے پہ آنے لگے ہسحاب بنے

یہ ظرفِ بحر کا آئینہ دار بن کے چلا بڑھا جو سوزِ جگر تو بہنا رہن کے چلا

نلک کی سمت سفرِ بہنا رہن کے چلا ہوا کے دوش پر برابر بہنا رہن کے چلا

غزال کے زور کو اک ہل میں توڑ دیتا ہے

کسی کے حکم سے دامنِ نوزِ دیتا ہے

شکِ مثال ہوا، اور پھر گرانی ہے حسابِ فیض کی اٹھتی ہوئی جوانی ہے

جمالی برق کو ہر لحظہ مٹو فشا نی ہے خدا کی شان کہ دامن کی آگ بانی ہے

وہاں ہی چرہ پڑی، دل کے داغ جلنے لگے

اندھیری رات جو پانی پھر سراخا ملنے لگے

شبِ سیاہ کچے برف سے بڑھا ئے جاتا ہے جنسی سے برق کی خود سکڑا ئے جاتا ہے

ستارہ ہاریوں سے جگمگاتے جاتا ہے فلک کے تاروں کی دنیا چھپاتے جاتا ہے
 شال میٹھ کر تپا کھیلے ہوئے تار سے

بنا جو ابر، تو نکلے ڈھیلے ہوئے تار سے

وہ رُوح پھونکی کہ مرنے والا دیے اس نے ہلک رہے تھے پوشیلے بچھا دیے اس نے
 زمین پر فیض کے دریا، بسا دیے اس نے رُخ ہوا سے، ہر دے اُٹھا دیے اس نے
 گل اپنے جلوئے رنگیں میں سکرانے لگے

زمین پہننے لگی، کھیت بھلہانے لگے

سنبھل دسکتے تھے، جم کر برسے والے ابر ہوا کے دوش پہ، پلنے رہے سنبھالے ابر
 زمیں پہ پھینکتے تھے مریحوں کے جھالے ابر وہ نکلنے لگی گشتائیں، ادھ کالے کالے ابر

فلک کی اُبروؤں کی طرح چڑھ گئے، دریا

گشتا کا زور گشتا جب، تو بڑھ گئے، دریا

جو چاہے وہ تو اثر کا سیلاب بننا ہے خدا ہی جانے کہ کب جو بحرِ سماب بننا ہے

زمانہ ایک ہی انقلاب بننا ہے فلک پہ ابر، زمین پر گلاب بننا ہے

نگاہِ عقل سے دیکھیں، جو حق کے دشمن ہیں

ہر ایک قطرہ میں پہناں، عسارِ گلشن میں

ترے وجود میں اور شبہ اے خدا کی پناہ تری عطا کو نہ سمجھ، تو عقل ہے گمراہ

دباں بن گئی کوئی چمن میں بے اکراہ کہا کہ آقا، کیا ان لا الہ الا اللہ

سکے سپہرِ کشتِ سختی غضب کی دامن میں

ہزاروں اٹھکے، اٹھنے لگیں زمانے میں

تری عطاؤں پہ عقلِ سلیم کا احسان عطا پر دامنِ گرد و اُز میں کا مال و سناں

ہزاروں رنگ سے رنگے، لگی فلک کی شام کھڑا تھا اُطروشِ شام، پہنچے اُترام

بنی نہیں تبدیل جو ہر سیاں، ستمیں دانوں کو

مگر ٹھکانے لگے، منتیرِ کس نو آبی

سحاب فیض جو ہر سدا تو بحرِ رحمتِ جلِ تھل
یہ انقلابِ ہایہ تعبیر اور یہ رد و بدل
یہ ناتوانوں میں قوت ہے دیکھو نہ بدل
طبقِ زمین کے اور توڑ دے ہری کوئل
کوئی قوی ہے ضعیفوں کے ساتھ ساتھ خود

خود کے ہر دے میں پنہاں ہے کوئی ہاتھ خود

نہار میں ہے، نگرہ دل ہے صاف دانے کا
ہے گردِ کعبہ قدرت طواف دانے کا
نہ دلیتا ہے کوئی خلاف دانے کا
شکافِ ظاہر کن ہے شکاف دانے کا

زمین پر کوششیں قطروں کی کامگار ہیں

لاجو خاک میں، برہنیاں منشا رہ ہیں

ترے کرم کے تصدیق تری عطا کے ثمار
تخا تیرا حکم، جہد ہی نامیہ تھی بر سر کار
زمین کی گود میں لیں کروٹیں ہزاروں بار
اُس ایک دانے سے پورا شجر ہوا تیار

کھلا خداوندِ دروں ایسے پردہ دار ہے

کسی کو پھول لے اور کسی کو خار ہے

کسی کو برگ دیے اور کسی کو برہنشا
اے اثر نہ دیا، اور اُسے اثر بخشا
اے بنارِ محسوس، اُسے شمر بخشا
خلش کسی کو عطا کی، کسی کو زربخشا

کسی کے کان میں شبِ بنم کو گو خوارہ کیا

کسی کے دامنِ نازک کو پارہ کیا

کوئی بے خشک جہن میں، کوئی تروتازہ
کسی کے کُسن کا، اور پنجا فلک سے آوازہ
کسی کا رنگ نہ بیگا، کوئی ہے پُرنازہ
ٹھگت رہا ہے کوئی شاخِ کج کا خسیانہ

نہ انتقام کسی لے علی الزور سے لیا

بڑے درختوں نے چھوٹوں کا خون چوس لیا

نریاں ہیں اسی میں راہِ رازِ فطرت ہے
امولِ خاص پر مبنی، ہر اک حقیقت ہے
برت رہا ہے اُسے، وہ جو رتبہ تدریج ہے
نہ اس میں ہے کوئی شکوہ، نہ کچھ شکایت ہے

نفا کے نور سے گذرے روشتات ملی

ہزاروں بار سے تب کہیں حیات ملی

جراہیں نے پائی مسرت تو اس کو غم بخشا کسی کو کر دیا بھجان، کسی کو دم بخشا
کسی کو داسن بھرا، اور کسی کو نیم بخشا کسی کو دے دیا زلمہ کسی کو کم بخشا

کھیلنے لگے رازِ نادانان سے مشیت کے

یہی سمجھو تو تصرف میں مالکیت کے

خدا بھاد ہوا، تب کہیں نبات، بنی نباتِ ارض سے جواں کی کائنات، بنی

ہوا یہ قدر، تو پھر آدمی کی ذات، بنی بغیر اس کے نہ دنیا میں کوئی نبات، بنی

ہر ایک وقت میں اور رنگِ ماہیت بدلے

تغییرات ہوئے رنگِ ماہیت بدلے

جہاں میں منزلِ آخرِ جہاں دکا ہے بشر اب اس کے ہاتھ میں ہے اختیارِ غیر و شر

ادھر عز میں ہے، اُدھر ہے فلک ہے اس کی نظر فنزل اور ترقی میں دونوں ہیں رہبر

یہاں ہے خاک ہے، یا فلک ہے چڑھ جائے

ترقیوں جو کرے، تو ملک سے بڑھ جائے

تغییرات ہوئے، اور کوئی قسم نہ ہوا بھوں پہ آیا کسی کے نایک بھی شکوہ

کہیں نہ اس کے بے آدمی کا دل تنہا غم نے دیکھ لیا، اور عاقل نے سنا

یہ جان دیتی ہے اور جان بنی جاتی ہے

نباتِ قدرِ حیوان بنی جاتی ہے

نباتِ ارض ہے، جہاں یہ نہ ہو دوسرا ہے اس میں روحِ نباتی؟ سہی ہے اس

ہے دوستوں سے اسے اُنس دشمنوں سے ہر اک فلک کا رنگت ہے مسہِ انگائے رہتی ہے آس

کہ اس کو غلظتِ کفِ دہر سے ملا نہ کیا

ہزاروں مختلفاں جمیلین، مگر گلا نہ کیا

سہرہ نگارین بوسِ ماہِ نباتات نے اس حقیقت کو اُنس سے ثابت کیا ہے۔

فطام دلوں کا دن مات سے سبق سیکھو ہر ایک ذرہ کی اہمات سے سبق سیکھو
نظام دہر کے آیات سے سبق سیکھو غول وہ کے نہایت سے سبق سیکھو

بیزرگے ہوئے، منہ سے کچھ کہنا نہ کرو
مستحقوں کا نہیں علم، تو محلات نہ کرو

معاذ طرف جتنا بھی جس کا، اُسے دی بخشا ہنسی گولی کو سلی، اُدس کو سلا دونا
کہیں ہے روکش تقدیر بی بیچ سبیل کا دل بہا رہیں اُترا ہوا کہیں کا نسا
کسی کو رنگ دیا، اور کسی کو بوجھنشی
صدف میں قطرہ نیساں کو آبر و بخشا

خدا جبر پسند نہ کرے، وہ ہجر کی نہیں کہ جذبہ اصل کی مقدار فریاد ترک نہیں
جڑیل کی ریشہ روانی ہے جو، شمر کی نہیں ہے اُس کے ہاتھ میں تقسیم اپنے گھر کی نہیں
کسی پہ یہ ہوا قساع، تو اُس کو بخش دیا
کسی کو فروش دیا، اور کسی کو بخش دیا

حکیم وہ ہے، تو بھل کہیا مفضل کو سپیدی برقی کو دی، اور سیاہی بادل کو
کھاؤ دشت کو بخشا، گھناؤ جنگل کو سناٹا اپنے میں پیدا کرو نہ یوں بھل کو
مٹاؤ مقل سے، قدرت کے مصرف کو دیکھو
شکایتیں نہ کرو، اپنے مصرف کو دیکھو

مقل مشکوہ نہیں، یہ نظام عالم ہے جرد فریب یہاں انتظام عالم ہے
کسی کے دستِ قضا میں نظام عالم ہے نئے ہیں طرز، عجب صبح و شام عالم ہے
کے سبھا لو گے، جب خود سبھل نہیں سکتے
ہر باغ عقل اس اندھی میں بھل نہیں سکتے

سلام

راستہ حق کا ہوا ہی کرتا ہے اکشر نیو دیکھنا دیوارِ کعبہ میں بنا اک دریا
روکشِ جنت ہے اشکِ غم سے روئے ہونیں آنکھوں ہی آنکھوں میں پیدا کر دیا کو فریا

آئے دو سراج کی شب بڑھے دو فوقِ مال
رکھ چکے ہیں پاؤں بچین میں جوانی کی طرح
دیجئے دوش رسالت پر امامت کا عروج
حالی راہت بچے کہنے مشق پلٹے بار بار
حق پہنچئے فرخ احمد شامِ جہتر اور علی
ختم کا میداں دستِ مرسلِ لہامِ تیغِ دہرے
جھڑیوں میں رُخ کی چمکا خطِ تقدیرِ حبیب
فاطر آئیں عدالت خواہ جن کے زیرِ عرش
نوکِ فیزہ پر بھی مشغولِ تملوت ہیں حسین
کا پختے ہاتھوں پر لے جاتے ہیں بچے کو حسین
شقی سی تربت میں رکھ کر لاش کو بے شیر کی
بھائیوں کو سنائے کٹر اکے رخصت کے لیے
رودہا ہوں غم میں شہ کی بھلتے ہیں رخسار کے بھول
سب کیا کرتے ہیں اے محبوبِ بدعہ شہ مگر
جب اٹھاتے ہو قلم تم کہتے ہو اکشرِ نیا

رباعی

کشتیِ تلاوت کی کھینے والے نہ ہے
اندکے حق کا ذکر کیا دنیا میں
خالقِ عجز کے بچنے والے نہ ہے
بندوں کے حقوق دینے والے نہ ہے

بگسٹ عظیم آبادی، غلام دستگیر خان

پٹنہ کے ایک متوسط الحال، زمینداری پیشہ پٹان خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے والد عبدالکریم خان (حرف میاں خان صاحب) تھے۔ بگسٹ ۱۹۰۳ء میں اپنے آبائی مکان واقع محلہ موہی کڑہ (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ اسی تعلیم دوسری درجے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ ہائی سسٹی اسکول سے پاس کیا۔ اس کے بعد اگرچہ کالج میں داخلہ لیا، لیکن حالات کی نارسا مدت کے باعث یہ سلسلہ چل نہ سکا۔ دو سال بعد ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ اس میں بھی کوئی خاص ترقی نہ کر سکے، جب پنشن پر سبکدوش ہوئے ہیں، تو سٹیٹلیٹ آفس میں پیڈاسسٹ تھے۔

شعر سے دلچسپی تعلیم کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ کلام پر اصلاح غالباً ہمدین شاہی (دہلی) مئی ۱۹۶۰ء سے لی۔ جب موصوف ۱۹۳۵ء میں نکلتے چلے گئے، تو سید جمیل مظہری کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ کلام میں، جیسا کہ تخلص سے عیاں ہے، مزاج کا پہلو غالب ہے۔ دورِ حاضر کے سیاسی اور معاشی مسائل پر طنز اور استہزاء ان کا خاص حقہ تھا۔ افسوس کہ کوئی مجموعہ کلام ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو عید الفطر کا دن گزار کر سرشام رہ گئے عالم جاودانی ہو گئے۔ حارسہ دل کا شکار ہوئے پہلی بھوی سے ایک صاحبزادی اور دوسری سے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

بہت مشکل سے ان کے چند شعر ملے ہیں، وہی بطور نمونہ ذیل میں درج کر رہا ہوں:

رباعی

چینی کی ہے بڑھ چوٹی قیمت: بگٹ ! بارہوی گرنک کی ہے قلت، بگٹ !
 کیا کروں یار سے تلخ کلامی کا گلہ ! پیکاری طاول کا خربت، بگٹ !
 ہے خرچ کی چیز، پان کھانا چھوڑو بھلی ہونٹوں سے اب گرانا چھوڑو
 جاسوس محلے میں بہت میں، بیگم ! لگ جائیگا ٹیکس، مسکرا نا چھوڑو

قطعہ

سمجھ میں کچھ نہیں آتا محبت کس کو کہتے ہیں
 تیغ یہ نکلتا ہے جو ہم ریسرچ کرتے ہیں
 یہ اک دائرہ ہے جس میں ہے کرنٹ لے جی ڈی کی کا
 کسی سے ہٹ کے سر نہیں، کسی سے مٹ کے سر نہیں

غزل

بھوک میں رخصت تبسم ہو گیا میں شہید ہجر گندم ہو گیا
 خط میں کچھ مٹکا تھا گھبروں یا ملے نامہ برجا کر کہاں گم ہو گیا
 ملے ملے رہ گیا کل یار سے بوسہ امریکا کا گندم ہو گیا
 شاپ ہر راشن کے اتنی بیڑ مٹھی یار سے میرا قصا دم ہو گیا
 ملک میں کچھ کم نہ تھا غلہ، مگر سینوری کے توند میں گم ہو گیا

عشق میں اپنا ہر خوشی ہوا
 ان کا بگٹ آپا ہے تم ہو گیا

اُردو سنی گنّوری، احمد بخش

سنی ۱۸۹۸ء میں یوپی کے ہزانے نامی قصبے گنّور (ضلع بدایون) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ نبی بخش ایک متوسط الحال کاشتکار تھے اور یہی ماحول انہیں بھی ملا۔ والد کا انتقال ان کی کسبی میں ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ان کی تعلیم و تربیت کا بار ان کی والدہ (محبوب النساء) بگم کے کندھوں پر اُٹھا، جسے اس حوالہ مند خاتون نے بڑے سلیقے سے اٹھایا۔

تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق، مقامی کتب سے شروع ہوئی۔ یہاں اردو کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ قرآن بھی پڑھا۔ پھر ۱۹۱۶ء میں گنّور کے مڈل اسکول سے انہوں نے درجہ بی۔اے کیا۔ اس کے بعد ان کے نامہ نگار حالات کے باعث مزید تعلیم ممکن نہیں تھی، اس لیے انہوں نے ملازمت کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ مادہ کانپور کے مشہور جوتوں کے سرکاری کارخانے میں ملازم ہو گئے۔

اس زمانے میں فنی سنی دہت حسین سخا شاہ جہاں پوری بھی اسی کارخانے میں ملازم تھے۔ ابرصاحب نے اگرچہ شعر گوئی ۱۹۱۵ء میں اپنے قیام گنّور کے زمانے ہی میں شروع کر رکھی تھی، لیکن اب تک کسی سے اصلاح نہیں لی تھی۔ یہاں کانپور میں ان کی سخا سے ملاقات ہوئی، تو یہ ان سے مشورہ کرنے لگے۔ اس لیے کہنا چاہیے کہ ان کی باقاعدہ شاعری کا آغاز ۱۹۱۶ء ہی میں ہوا۔ اہر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میرا ایک کاروباری معاملے میں بخا سے اختلاف ہو گیا تھا جس کے بدلے میں اس سے اصلاح کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حقیقت اس سے زیادہ ہے۔ ہوا یہ کہ جب ٹریننگ کالج کی سند سے کرہ صاحب قادری باغ کے (جسے اب جین پور کہتے ہیں) پرائمری اسکول، میں مدرس ہوئے، تو یہاں ان کی رادہ ہسوانی سے اکثر ملاقات

رہنے لگی جنہیں وہ پہلے سے جانتے تھے۔ رازشعر میں مستطی آسن، آسن امرہوی کاف
۱۱۹۳ء کے شاگرد تھے جیساکہ سب کو معلوم ہے، آسن خود داغ اف ۱۱۹۵ء کے ممتاز شاگرد
البدان کے نوذخوں میں شامل تھے۔ اس زمانے میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو
میں پریکٹر رہتے۔ رازکی ترضیب ہر ابر صاحب نے آسن کا لفظ اختیار کر لیا۔ لفظ کا یہی تعلق
ان کے اپنے تخلص کے ساتھ آسن کی نسبت کے مستقل اضافے کی بنیاد ہے۔ اس کے
بعد سنا شاہ جہان پوری سے اصلاح لینا بند کر دی۔

تقریباً چار برس کی ملازمت کے بعد ابر صاحب کا پورے گنور واپس آگئے چونکہ وہ
جُعنت سازی کے کارخانے میں تین چار سال کام کر چکے تھے، انھوں نے خیال کیا کہ اس
کاروبار کے اہر ہو گئے ہیں۔ اسی خط فہمی میں انھوں نے یہاں وطن میں جوتوں کی دکان کھولی۔
یہ تجربہ بالکل ناکام رہا۔ گنور میں انگریزی جوتے (بُٹ) کا رواج ہی نہیں تھا، سب
لوگ مقامی ساخت کا نرمی کا جوتا پہنتے تھے۔ لیکن اس سے بھی بڑی مشکل یہ تھی کہ کسی کو
جوتیار کرتے دیکھنا، ایک بات ہے اور خود جوتے پہننا، بالکل دوسری اردوؤں کا بھلا
آپس میں کیا تعلق! تجویز نکلا کہ تجارت کا تجربہ نہ ہونے کے باعث سال بھر میں ساری
پونجی کھو بیٹے۔

اب انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی طرف توجہ کی مولانا حکیم عبدالعظیم کمال گنوری سے فارسی
اور عربی پڑھنے لگے۔ فارسی انھوں نے مولوی رفیع احمد عاتقی بدایونی (پروفیسر ضیاء احمد
بدایونی کے والد) سے بھی پڑھی۔ تیسری کے بعد اسد اوزد ناسی کے امتحان پاس کیے۔
عرض حال اسناد کے بل بوتے پر انھوں نے محکمہ تعلیم کا دروازہ کھٹکھٹایا اور احباب کی
سفارش سے انھیں ڈسٹرکٹ بورڈ میں تعلیمی نوکری مل گئی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک
وہ ضلع بدایون کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، اگرچہ اس میں کاز یا وہ راز خاص
بدایونی شہر میں گزرا جہاں وہ ۷ سال رہے۔ اسی باعث وہ بدایون کو اپنا "وطن ثانی"
کہا کرتے تھے۔

۱۹۳۷ء میں ملک آزاد ہوا؛ اور اسی کے ساتھ فرقہ وارانہ فسادات بھی آئے جن سے

ملک کا امن تباہ ہو گیا۔ ابرصاحب اس صورت حال سے دل برداشتہ ہو کر راجپور چلے گئے جہاں ان کے شاگرد سید حسن علی حشر ریاست کے محکمہ تعلیم میں آفس سپرنٹنڈنٹ کے ذمہ دار تھے۔ ان کے شاگرد تھے۔ انھیں کی وساطت سے ابرصاحب کے داماد ناصر حسین افسر گوری اور بڑے صاحبزادے طریقت حسین تاملش پہلے سے رمانک شائل کا خانے میں ملازم ہو کر راجپور چائے تھے۔ اب حالات سے مجبور ہو کر ابر بھی اپنے بیٹے کے پاس راجپور پہنچے حشر صاحب کو معلوم ہوا، تو انھوں نے فوری طور پر انھیں ایک شبینہ اسکول میں ملازم کرادیا؛ پھر مناسب کارروائی مکمل کر کے مدرسہ عالیہ (اونٹیل کالج) میں ۷۵ روپے مشاہرے پر مقرر دوا دی۔ راجپور میں پانچ برس رہے اور وہاں سے ۱۹۵۳ء میں سبکدوش ہو کر گنٹور واپس چلے آئے۔

جب سید حسن راجپور کی کاگست ۱۹۴۰ء میں انتقال ہوا ہے، تو انھوں نے گنٹور میں استاد کے نام پر بزم حسن قائم کی تھی۔ وہ خود اس کے صدر تھے۔ اس بزم کے زیر اہتمام وہ مشاعرے وغیرہ کرتے رہتے تھے۔ اب راجپور آنے کے بعد انھوں نے استاد گرامی کی یاد میں اپنے استاد بھائی صغیر حسن مظفر ٹکری کے اشتراک سے ماہنامہ حسن جاری کیا۔ اس کا اس زمانے کے موقر پڑھوں میں شمار ہوتا تھا۔ جب تک راجپور رہے، حسن بھی شائع ہوتا رہا؛ ان کے ترک راجپور کے ساتھ ہی یہ بند ہو گیا۔ یوں بھی یہ گھانٹے کا سودا تھا جو ان کے شاگرد وادار احباب چندہ جمع کر کے پورا کرتے رہتے تھے۔

راجپور سے واپس آنے کے بعد انھوں نے بسر اوقات کے لیے آبائی پیشہ کاشتکاری اختیار کیا۔ ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ آئندہ شاگردوں کو اپنے کلام پر اصلاح کے لیے کچھ نہ کچھ پیش کرنا ہو گا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم ہر ایک خدمت کے لیے کام کرنے والوں کو اجرت دیتے ہیں؛ بازار سے کوئی چیز خریدتے ہیں، تو اس کی بھی قیمت ادا کرتے ہیں۔ استاد بھی کلام کی اصلاح میں اپنا وقت خرچ کرتا ہے، اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں سے شاگرد کی تربیت کرتا ہے، پس اسے معاوضے سے کیوں محروم رکھا جائے؛ اس کے علاوہ باہر کے شاعروں میں بھی ان کی بہت مانگ تھی؛ اور اس سے بھی خامی آمدنی ہو جاتی تھی۔ مزید برآں ۱۹۴۳ء

میں یوپی حکومت نے ان کا چھ سو روپے سالانہ ادنیٰ وظیفہ مقرر کر دیا۔ عرض ہے کہ اگر یہ اب وہ کہیں ملازم نہیں تھے، لیکن مادی پہلو سے انہیں کسی پریشانی کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی، ان کے ذاتی خرچ کے لیے ان کے پاس کافی وسائل تھے، بلکہ اپنی محتاط زندگی اور حدودہ کفایت شکاری کے باعث وہ یقیناً کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کے قابل رہے ہونگے۔

گتور میں وہ اپنی دو خرد سال پوتیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ۷ نومبر ۱۹۷۳ء شب کے گھانے کے بعد وہ صبح سول اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اگلے صبح ۱۸ نومبر صبح وہ در تک باہر نہیں نکلے، تو تقریباً آٹھ بجے ان کی بڑی پوتی ان کے کمرے میں گئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ خون میں لت پت مژدہ پڑے ہیں۔ شب میں انہیں کسی نے قتل کر دیا تھا۔ قتل کا سبب معلوم نہ ہو سکا نہ قاتلوں ہی کا کوئی سراغ ملا۔ لاش اسی دن پوسٹ مارٹم کے لیے بدایون گئی۔ جنازہ اگلے دن یعنی ۹ نومبر ۱۹۷۳ء کو رکھا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں گتور میں ہی پرانی سرانے کی پشت پر آبادی کے قریب کچھ زمین اپنے خاندانی قبرستان کے لیے خریدی تھی اس کا نام ”گھستان جاوید“ رکھا تھا، اسی میں دفن ہوئے۔

ان کی ۱۹۱۹ء میں ایگری (ضلع بدایون) میں شادی ہوئی تھی۔ چار بیٹے (طریقت حسین، ودیعت حسین، (حرف مناظر حسین)، نزہت حسین، فنی باقر حرف اچھن سیان) اور ایک بیٹی (مدیرہ بیگم) ان سے یادگار ہیں۔ مدیرہ بیگم اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں۔ چاروں بیٹے بھی ہندوستان میں رہے اور سب خوش و خرم ہیں۔ بیوی (عائشہ بیگم) کا انتقال ان سے سال بھر قبل ۲۷ نومبر ۱۹۷۳ء کو ہو گیا تھا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اردو زبان کی ترقی و ترویج میں ابراہیم کی خدمات بہت قابلِ قدر رہی ہیں۔ ان کے سینکڑوں شاگرد ملک کے دور دراز خطوں تک میں ملتے ہیں، اور وہ اپنی اپنی جگہ اردو کا علم بلند کیے ہوئے ہیں۔

ابرمدتوں مشہور تعلیمی ماہنامے ”رہنما“ تعلیم کے ادارہ تحریر میں بھی شامل رہے۔ ان کی کئی اور لسانی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اس سلسلے میں ان کی سیما بابر آبادی (دف ۱۹۵۱ء) سے چپقلش قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے سیما صاحب کی کتاب ”سنورالاصلاح“

میں دست شدہ تمام اصلاحوں کا تفصیلی جائزہ لیا تھا، جو رہنما سے تعلیم میں تقریباً تین برس قسط وار شائع ہوا۔ یہ مضامین کتابی صورت میں اصلاح الاملاہ کے عنوان سے چھپ چکے ہیں۔

اسی نوع کا دوسرا نقشہ نیاز مقسور کی سے پیش آیا تھا۔ نیاز نے کسی زمانے میں بہار والہ علیہ کے مزار کے تحت نگار میں مختلف اساتذہ کے کلام پر تنقید لکھنا شروع کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے حسن مارہروی کے کلام کو بھی لے لیا۔ ابراہیم استاد کے عاشق تھے؛ قدر شا انھیں یہ تنقید (بلکہ تنقیص) بہت ناگوار گزری، انھوں نے استاد کی حمایت میں نیاز کے اعتراضوں کا جواب دیا۔ نیاز بھی بلاتے بے دریاں تھے، اور ان کا مبلغ علم و فن بھی ابر سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ سلسلہ بھی بہت دن چلا۔

ہر کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ان کی تبدیلی مذہب ہے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلم گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شروع میں قرآن پڑھا۔ مذکورہ نعت اور منقبت لکھنے رہے؛ ان کا ایک دیوان (شبیہ) اسی صنعت کلام کا مجموعہ ہے۔ لیکن بعد کچھ دنوں بھائی ہو گئے۔

قصہ یوں ہے کہ جس زمانے میں ابراہیم صاحب گنڈر میں مقیم تھے، ایک صاحب بلاک ڈیو پٹ کے محلے میں ملازم ہو کر جاناؤنی و تحصیل گنڈر آئے۔ ابراہیم ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا۔ وہاں ان کے والد ارفعی حسین عابدی سے ملاقات ہوئی۔ عابدی صاحب بھی تعلیمی ملازمت میں رہے تھے، اور پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ مذہب بھائی تھے۔ ابراہیم صاحب کی ان سے صحبت رہنے لگی، جس میں لا محالہ مذہب پر بھی گفتگو ہوئی۔ اسٹیشن کی ترقیب و تشویش پر اور آخر کے تحت ابراہیم بھی بھائی مذہب اختیار کیا۔ ان کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

- (۱) اصلاح الاملاہ (دسمبر ۱۹۳۹ء)؛ (۲) شبیہ انگلیں (دسمبر ۱۹۵۲ء)؛ (۳) نیچے؛
- غزلیات (دسمبر ۱۹۵۲ء)؛ (۴) میری اصلاحیں؛ دوسرے (دئی ۱۹۵۴ء)؛ (۵)؛
- قریب غزلیات (جائیداد ۱۹۴۳ء)؛ (۶) شبیہ؛ حمد و نعت و سلام (دئی ۱۹۶۶ء)؛ (۷)؛
- غزبے؛ غزلیات، انگلیں، استغفات (دئی ۱۹۶۹ء)۔ بہت سا کلام ہنوز زیور طبع

سے آراستہ نہیں ہوا۔ اس میں غزلیات اور منظومات کے علاوہ ایک پورا مجموعہ بہانیت سے متعلق بھی ہے۔

ابراہیم کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جو کچھ اساتذہ سے سیکھا، وہ تو تھا ہی، اس پر انہوں نے عمداً اپنے آپ کو حروف کات کی ایک نئی فہرست کا بھی پابند بنالیا تھا، جن میں سے بعض معقول ہیں، بعض غیر ضروری، ابھر حال وہ ان پر قائم تھے۔ ان کے استاد احسن مارہروی فن شعر کے پورے ماہر تھے، ابرہیم نے ان سے حاصل کیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فن اور زبان کے پہلو سے ان کے کلام میں کوئی قسم نہ رہا۔ وہ ایک دیندار مسلمان گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ اس لیے وہ کسی حریفانی اور براہروی کے روادا نہیں ہو سکتے تھے۔ یہاں مذہب اختیار کیا، تو وہاں بھی اخلاق کی پابندی ہونے کی توں قائم رہی۔ غرض ان کے ہاں آپ کو اطلاق اور تہذیب سے فرار کوئی ضرورت تلاش کر لے پر بھی نہیں ملے گا۔

ان کے ملبوعہ سے قدر ازل کے اشعار کا اچھا انتخاب تیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ مجموعے آسانی سے دستیاب ہو سکتے ہیں، اس لیے نوئے کے طور پر چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں:

وقت خود مانوس کر دیتا ہے، لے تازہ میرا چند دن رہے، نفس بھی آسپاں ہو جائیگا
ہم سے تو اپنا قصہ غم، فہم کی طرح مزاں بدل بدل کے سنایا نہ جاسیگا
ہمارے دوزی بری وحشت میں کوئی کیا کرتا استیں بیل نہ چکی تھی کہ گریبان نکلا
جس کو میں بھی کہ نہ سکوں، جس کو وہ بھی سن نہ لیں

حال میں تک آپہنچا، در دہرے افسانوں کا

آپہ خوش دوست ہیں، دل سے بھی دشمنی نہ تھی اب یہ خدا کو علم ہے، کس نے مجھے مٹا دیا
حرم میں دیر میں، کیا فرق ہے یہ تم نظر نہ لیں ہیں تو جھوٹے واسطہ رکھنا، جس دم جانا
جلا سے برق کو نہ دے، آگ سے، آذھیال آئیں ہیں لے ابراہیم جھوڑ کر اپنا کدو حسانا

ہراک دھڑکن سے دل کی نودست کا محمد کو پیام آیا

محبت میں خدا سے آرزو، یہ کب مقام آیا

بہت سے مرحلے گزرنے پڑے مگر نہ جان میں
 کبھی ریتِ الصنم آیا کبھی ریتِ اکھرام آیا
 نکھر رہیوں نامہ شوق ان کو یوں
 جیسے آہی جائیگا اس کا جواب
 مجھ کو جلوں کی ان کو نظر کی طلب
 عشق بھی آتش لب جس میں بے طلب
 غالباً آگئے دن فصلِ بہاراں کے قریب
 ہاتھ رک جاتے ہیں آگے گرجاں کے قریب
 دینے آئی ہے موتِ خم سے نجات
 کس کو ملتا ہے اب مزاجِ حیات
 روز ہوتے ہیں راہِ ہر سید
 روز لٹنے ہیں کاروانِ حیات
 ز سنبھالے جنوں عشقِ اُغر
 عقل پر بار کھسکی تھی حیات
 لی نہیں سکنی خم سے نجات
 عمر بکرت تا بہ حیات
 وارجا الفت دل میں جلوے آنکھ میں ہر میں جنوں
 ایک دنیا کے اٹھے ہیں اتنی محفل سے ام

ہم نے جہاں عشق میں کاٹی ہے زندگی
 آگاہِ شام سے ہیں اذواقِ سحر سے ہم
 یہ بار بار ہوا ہے کہ ان کے خیال میں
 زودام بھر گئے رہے بام و در سے ہم
 نام ان کا سن کے یوں لھوئے کہ ہر اک پا گیا
 جب کبھی ہلکے ہیں ایک ہیں اسی منزل سے ہم
 آغا زِ محبت کے انجام کو کیا کیجیے
 جب درد کا شکوہ تھا ادبِ جان کے لئے ہیں
 دل میں ہے سوزِ عشقِ نعتِ دہلی
 دوزخ ہے میرے سینہ میں جنتِ نگاہ میں
 بھردل سے لاکھ دے کے اے لی گئی نجات
 سر جس کا آگیا ترے در کی پناہ میں
 میرے مرنے کا موت ہر الزام
 کام جس کا ہے اس کا نام نہیں

عزیز اس سے تو ہم نے دین و ایمان بھی نہیں رکھا
 اب آگے جو کچھ آئے ہو خاک کے دین و ایمان میں
 مرے نالوں کا یوں چسپا کر میں تو ایک انسان ہوں
 پڑی ہو جن میں، توڑا دے ہیں خراسے سنگ و آہن سے

تو اپنی نفس میں چین کا دھواں ہے
 بھلی کہیں گری ہے، ہوا ہے اثر کہیں
 اسی میں میری عشق میں ڈالے ہیں تفریق
 میں ہوں کہیں خیال کہیں ہے نظر کہیں

اہلِ خرد کی وحشت دیکھو دیوانہ تو پھر دیوانہ
 فنا میرا سن لو آج، ورنہ سونگے گل یہ دنیا کی زباں سے
 تم یا دیکھیں رکھو گے، ستم بھی نہ کر دو گے اس کا بھی یقیں ہے مجھے، اُس کا بھی یقیں ہے
 فنا نہ زندگی کا یوں بھی کم دکھش نہ تھا، لیکن لگے چار چاند اور اس میں غزالہ محبت ہے
 اک حرا لطف، ایک تیرا ستم میری موت وصیات کچھ بھی نہ تھی
 صرف حسن خیال تھا میرا نگہ انگشت کچھ بھی نہ تھی
 دل کو تڑپ کے تمام کیا ہے کبھی کبھی یوں بھی تمہارا نام لیا ہے کبھی کبھی
 بادل میں بجلی بھرائی کس کا کرنے لی انگڑائی
 دیکھنے لگا دل سرد آہوں سے اُبھری چوٹ، چلی پُر دانی

ترے نوبہ بھرے پھونک دی چمن مراد کی ہر کلی

نقطہ ایک شاخِ دنیا ہی تھی جو بے فیض عشقِ ہری رہی

نم سے گھبرا کر آہ کون کرے! عشق میں یہ عشاء کون کرے!
 آپ سے رسمِ درآہ کون کرے! عمر بھر آہ کون کرے!
 پُر سکون فقر کے بھی لالے ہیں طلبِ عزت و جاہ کون کرے!
 خوبوں درد کی لطافت میں کس کو فرست ہے آہ کون کرے!
 اُن کی نظر میں جد صرا، ادھر دنیا میری جانب نگاہ کون کرے!
 ترکِ اُلغٹ! ایسے معاذ اللہ! اپنی بستی تباہ کون کرے!

سب سترتِ طلب ہیں دنیا میں

اب رہنم سے تباہ کون کرے!

سلام مچلی شہری، عبدالسلام

یکم جولائی ۱۹۳۱ء کو مچلی خیر مغل جوہنپور کے محلے مولویانہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کا متوسط الحال خاندان پشتون سے مقیم تھا۔ خاندان میں علمی روایت تھی چنانچہ ان کے جدِ امجد مولوی محمد انیسل جوہنپور کی عالمِ حدیث کی حیثیت سے خاصی مشہور تھے۔ اس کے باوجود سلام کے والد محمد عبدالرزاق نے کپڑے کا کاروبار اختیار کیا۔ وہ کبھی سے بیکنس پر مال منگواتے اور اسے مچلی شہر اور رضا خات میں فروخت کرتے تھے۔ محمد عبدالرزاق صاحب چاہتے تھے کہ بیٹا علومِ دین میں فاضل بنے، چنانچہ عبدالسلام کو پہلے قرآن حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد ڈسٹرکٹ بورڈ اور مولڈ اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۵ء میں آٹھویں درجے کا نتیجہ اچھا رہا کہ سرکاری وظیفہ ملا۔ اب یہ فورس ہائی اسکول فیض آباد میں آ گئے، لیکن دسویں کے امتحان میں ناکام رہے۔ یہ امتحان انھوں نے بعد کو ۱۹۳۹ء میں پرائیوٹ طور پر پاس کیا۔ باقاعدہ تعلیم اسی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ البتہ اس کے بعد اردو کے بعض امتحانات غیر کی طرح پاس کر لیے تھے۔

وہ ابھی طالب علم تھے کہ نظم و شعر لکھنے لگے۔ بلکہ انہیں تمام میں انھوں نے ایک رسلۃ نغمۃ کی ادارت بھی کی جو فیض آباد سے نکلتا شروع ہوا تھا۔ فیسوں کو یہ جلد ہی مالی مشکلات کا شکار ہو گیا۔ اس کے صرف پانچ شمارے شائع ہوئے (نومبر ۱۹۳۷ء، دسمبر ۱۹۳۷ء، جنوری ۱۹۳۸ء، فروری ۱۹۳۸ء، مارچ و اپریل ۱۹۳۸ء) مشترکہ شمارہ اسی زمانے میں انھوں نے نظم میں شین مچلی شہری (تلمیذ داغ دہلوی) سے اصلاح لینا شروع کی۔ لیکن چونکہ دونوں کا مزاج بالکل مختلف تھا، جلد ہی یہ تعلق منقطع ہو گیا، لیکن بعض دوسرے

اصحاب کی طرح انھوں نے کبھی استار کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہا، نہ ان سے اصلاح لینے کے واسطے کو غلط بتایا۔

۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنے کلام کا پہلا مجموعہ ”میرے نئے“ کے عنوان سے مرتب کیا؛ یہ اگلے برس ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آیا۔ اس میں کلیم دھرمون میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پہلا حصہ ”پھول“ تھا، جس میں رومانی اور جذباتی نظریں اور گیت تھے؛ دوسرے حصے ”انگارے“ میں غالباً سیاسی موضوعات کی منظومات تھیں۔ اردو سوسائٹی لکھنؤ دانشور کی ایک تحریر سے جو کتاب کے آخر میں چھپی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کے جنگی حالات کے پیش نظر انھوں نے ان سیاسی نظموں کو کتاب سے حذف کر دینا قرین مصلحت خیال کیا۔ انھوں نے اس امر کا بے فکر بعد کو بھی یہ کہیں شائع نہ ہونے اور بجائے غالب مثنوی پر لکھیں۔

ملازمت کا آغاز انہوں نے پرنسپل کے کتب خانے سے ہوا۔ ۱۹۴۰ء میں یہاں کے مضرقاتی شعبے میں کلرک کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ لیکن پڑھنے کا شوق پہلے سے تھا، اس ملازمت نے اس پر جلو کی ایساں انھیں اپنی معلومات اور قابلیت کے بڑھانے کے مواقع پیش کئے۔ ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے، اور شروما میں اس کے لکھنؤ دفتر میں نام کرتے ہیں۔ انھیں ایام میں وہ لکھنؤ یونیورسٹی کے اردو سائنس ”مغرب“ کے مدیر، عربی مفسر ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں آٹھ برس تک کام کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں ان کا سرینگر تپا دلہ ہو گیا؛ یہاں ان کے نئے نئے لکھنے کا کام تھا۔ چونکہ یہاں وہ عارضی مستعار خدمت پر لگے تھے، اس لیے یہاں کے ختم ہونے پر لکھنؤ واپس چلے گئے، اور بالآخر تپا دلہ پر واپس چلے آئے۔ یہاں شروما میں اردو مجلس کے شعبے میں رہے، آخری ایام میں اردو مدرسہ میں پروفیسر کے عہدے پر فائز تھے۔

وکی کے قیام کے زمانے میں ان کی کئی چیزیں شائع ہوئیں۔ دوسرا مجموعہ کلام ”دوستیں“۔ کتبہ اردو لاہور نے شائع کیا، جو ترقی پسند عقیدوں کی کتابیں شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرنے میں پیش پیش تھا۔ ۱۹۴۳ء میں وکی سے کیتوں کا مجموعہ ”پانی“ ساقی بکڈ ہو

نے پیش کیا۔ اسی دور میں ایک ڈاکٹر "ہارون بند کھل کھل جاتے" دیکھتے ہیں چھپا۔ ۱۹۶۵ء میں انہیں ترقی درود ہندو اعلیٰ گزٹھم نے ان کے کلام کا انتخاب شائع کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء کے پدم بھوریت کے موقع پر انہیں اولیٰ خدمات کے اعتراف میں "پدم شری" کا امتیاز دیا گیا تھا۔

انہیں بھی اپنے کئی ہمعصوروں کی طرح طبیعت کی بُری لت تھی۔ اس نے ان کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا۔ وسط ۱۹۷۳ء میں صحت بہت خراب ہو گئی، تو اسپتال میں داخل ہو گئے۔ علاج معالجے سے حالت کچھ نہ بہا صلاح ہوئی، تو وہاں سے نکال دیا گیا۔ لیکن طبیعت اچانک پھر خراب ہو گئی، بظاہر وہ شدید یرقان کے مریض تھے۔ اب ڈاکٹروں نے جنگ پڑھ کر جراحی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۳ نومبر کو آپریشن ہوا، تو کھلا کہ انہیں جگر کا کینسر ہے۔ اس کے بعد وہ پورے ہوش میں ایک دن بھی نہیں رہے۔ اس حالت میں ۱۹ نومبر (۱۹۷۳ء) صبح پونے آٹھ بجے راجی ملک بچا ہوئے۔ لاش گھر لائی گئی۔ اسی دن ۵ بجے شام جنازہ اٹھا اور انہیں بہادر شاہ ظفر راج گڑھ کو ٹرانسپورٹ شاہ کے قریبی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

اِنَّ لِلّٰهِ وَلِيًّا اَللّٰهُ مَنَّا اٰجِزٌ قُوٰی -

دسمبر ۱۹۴۲ء میں ان کی شادی شوانتر (منسلح الہ آباد) کے بخشی محمد امجد رحوم کی صاحبزادی راجدھاتوں سے ہوئی تھی۔ اپنے چھ بچے سات بچے چھوڑے، پانچ بیٹیاں (السری، پردی، یاسین، تریس، ششیرین) اور دو بیٹے (انجم، انور)۔ حکومت ہند نے سلام رحوم کی دیرینہ خدمات کے پیش نظر خاندان کو تین ہزار روپے یکمشت عطا کیے اور دھرم دیا امانت وظیفہ مقرر کر دیا۔

سلام کے کلام کی نفاذ دانی ہے۔ وہ بڑے آدرش وادی اور محبت وطن تھے۔ اسی لیے بعض حلقوں میں وہ "مردوں" شاعر وادان کے لقب سے مشہور رہے۔ نمونے کے چند شعرواخط دیں:

آسان اب بھی تجھے ہم پہنچیں ہے کہ نہیں | دیکھ جنت سے بھی دلکش، زمیں ہے کہ نہیں |
درد مند ہر ایسی خوش مشور تریں | آج پہلے سے ہیں کچھ اور حسین ہے کہ نہیں |

پاؤں میں سراس کھاری، کی سہانی پازیب
 کھیتیاں کھکشاں کی امہ دھور مشید کے باغ
 کاشتر صورت افشاں بجبیں ہے کہ نہیں
 رشک فردوس بھاری یہ زمیں ہے کہ نہیں
 جہد انہم میں جسے دھوندری ہے دنیا
 وہ سکون دل دیتا نہیں ہے کہ نہیں
 وہ جو تھا چند برس پہلے اسپر مغرب
 وہی مستقبل شرق کا امین ہے کہ نہیں
 ذر نشان ہوتے ہوئے آکھوں غزل میں سلام!

اور کئی پرچم رنگ میں ہے کہ نہیں!

اکھا انکڑائی لو، اب چاند کو چھونے کے لیے
 یوں تو کہتے بھی ہیں، ہنستے بھی ہیں گلزار میں بھول
 خود تو کھٹنے سے یہے بنو قبا میرے بعد
 کوئی طوفانی ہبہ راں نہ اٹھا میرے بعد
 لے تھکانے فم دہرا میں کیسے آؤں
 لذت درد و غم یا رکھ کیسے چھوڑوں
 میں غزلیں میں بھی ہر ستارہ رہا ہوں اس کا
 موسم گل میں جن ناز کو کیسے چھوڑوں
 آج تو ضیع ہواؤں سے یہ کہتی ہے، سلام!
 رات بھاری ہے، میں بیمار کو کیسے چھوڑوں

درد ہو دنیا سے میری، یاد بچو بھالو، سیر کر دو
 اس میں اُترے جنگل بھی ہیں اور حبیب نقارے بھی
 میرے دل کی رنگیں راتیں، میرے دل نے رنگیں دن
 جلوہ نگین ہیں داغ بھی اس میں، روشن چاند شامے بھی
 جی میں آئے، روکے ہو، جی میں آئے، ہنس بھی لو
 یاں سوئی کی لڑیاں بھی ہیں اور آکھو کے دعا سے بھی
 چاہوں یہ آکاش بھادوں؛ چاہوں، اس کو بچو یک بھی بلا
 دوزخ ہی ہے بر قوتش بھی، کھیل رہے ہیں تلے بھی
 چاہئے بڑھتی پیگنیں دیکھو؛ چاہئے آکر سوگ کر دو
 آکھو کی سا دل رت بھی ہے، الفت کے دوسے بھی
 چاہئے، دیکھ راکھ مناؤں، چاہئے تجھ نزلہ ہر دم کے گیت
 دل میں دکھ کے ارے بھی ہیں، پہلو میں ہپا سے بھی

میری دنیا، کیسی دنیا، کیا ہوا اس دنیا کا

اس میں جو کچھ کے آئیں وہی ہو ۔ ۔ ۔ چاند تلے بھی

جاگ رہا ہوں نیند میں آنسو کھیل رہا ہے

اور جن میں آہ اکب شادی دھم دھم ہیں

اندھتہ، وسعتِ ذوق نکلے ہا

پھر کو خرقِ بیانِ حالِ فراق

بخت، اسے ثوقی! اور چار قدم

فوتہ مرا جو جاتی تصور بہ ناناہ ووں

میرے تصورات کو چلے آسرا تو دور

ذیل کی غزل انھوں نے آپریشن سے ایک دن پہلے ۱۲ نومبر ۱۹۷۹ کو کہی تھی۔

یہ غائبانہ کا آخری کلام ہے:

وہ چشمِ ناز مری مستہ یوں ابھی ہے کہ اے!

اک ایسی چوٹ دلِ دادر پر لگتی ہے کہ اے!

کبھی ہنسنا تھا زجاجی پہ دیکھ کر مشہم

ابھی تلک مری ہلکوں پہ وہ ٹپکتے کہ اے!

تمام شہر بظاہر صیحاں ہے، میمن

تمام شہر میں کچھ ایسی بے بسی ہے کہ اے!

مجھے بھی دیکھ کے عقل میں یوں تو رہی، مغرور

بظاہر ایسا اک اندازِ برہمی ہے کہ اے!

میں چھڑتا تو ہوں ہر بار اک نیا نقشہ

صلوے ساز کچھ ایسی دلی دلی ہے کہ اے!

وہ اور ہونے لگے مضامین سیکڑہ مبارک ہے

مرے لیے تو وہ انجامِ سیکڑہ ہے کہ اے!

یہی کہا تھا کہ تم شہرِ دل کی ملکہ ہو
 میں اتنی بات پہ کچھ ایسی برہمی ہے کہ ابا سے
 تمام فہر میں ہے خود انقلاب، سلام!
 تمام چہروں پہ ایسی فسردگی ہے کہ ابا سے!

روح بھی کھمارا رہی ہیں بھی کہ لینے تھے۔ ان کے کلام میں ہندوستان کے دوسرے فارسی
 گوینوں سے کچھ ماہہ امتیاز نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ غزل انھوں نے ایک موقع پر مجھے دی تھی
 میں اس خیال سے اسے یہاں نقل کر رہا ہوں کہ محض غلط ہو جائے،

بہارِ گلشنِ آملہ، نشاطِ قلب و جاں آملہ	ز ہر سوزِ ذوقِ نجیبک و سارِ دقہری نغمہ غزل آملہ
بارِ دروغ و کورہ دور، مہا ستاری قصہ	بشاخِ ٹھٹھتاں، شکر، عرار و مینراں آملہ
قُب جوجا، جامِ برکت، قدرِ خوشے خرد و سوز	بستیِ بجز از خودِ عشق، نغمہ و نہاں آملہ
کتابِ حکمت و دانش، ہمہ واسوئہ ہیں ست	نمی بینی کہ در اعظم ہم، سرِ قمرِ میناں آملہ
چہ آتشِ با برافروزد، بہ صحنِ گلشنِ لالہ	جنونِ پاک و بد و قصہ خرد آذر و دہ جاں آملہ
چہ مہدی پُر نشاط آملہ، چہ دورِ انبساط آملہ	بر لبِ عاشقانِ بر شاخِ آہو شاہاں آملہ
نسیم صبحِ پُراں شد، نسیمِ گلِ مشتاہاں شد	ہی گردِ سبکسورِ کراں جاں سُرِ کراں آملہ

تاب حیدر آبادی، عبداللہ بن احمد

حیدر آباد کے مشہور ترقی پسند شاعر تھے۔ ۷ جون ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام احمد تھا، جس سے یہ ابن احمد کہلائے۔ ان کا متوسط الحال حوب خاندان تھا۔ تعلیم حالات کے باعث ابن احمد اعلیٰ تعلیم سے محروم رہے۔ مدرسہ نظامیہ اور کاشغر پائمنڈ شالائیں کچھ پڑھا اور ہر کسب معاش کے لیے بلد بہ حیدر آباد میں ملازمت اختیار کر لی۔ پڑھنے لکھنے کا شوق غفلت و شباب سے تھا۔ عزیز بزم مشکل سے ۱۵ برس کی ہوگی کہ شعر کہنے لگے۔ بلکہ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۴ء میں انہوں نے خود ایک ہفتہ دار اخبار ”اروز“ جاری کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کام کے لیے محض شوق تو کفالت نہیں کرتا! اس کے چلانے کے لیے جتنا دوسرا درکار تھا، وہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ سال بھر کے اندر پرچہ بند ہو گیا۔

ابتداء میں تخلص آفاکہ کیا اور حیدر پاشا حیدر سے مشورہ لیا۔ بعد کو دکن کے مشہور استاد بہر علی صفی، اور رنگ آبادی اف ۱۴ مارچ ۱۹۵۴ء کے واسن سے وابستہ ہو گئے۔ کلام بھی اچھا تھا اور پڑھنے بھی خوب تھے، ان کے ترنم میں سوز کا پہلو نمایاں تھا، جوان کی زندگی کے ناساز گار ماحول اور ناموافق حالات کا آئینہ دار تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ہار نہیں مانی، نہ کبھی یابوسی کا اظہار کیا۔ حیدر آباد کے ترقی پسند طبقوں میں انہیں ممتاز مقام حاصل تھا، بلکہ وہ انجمن ترقی پسند معنفین آندھرا پردیش کی مجلس عاملہ کے رکن بھی تھے۔

ان کے کلام کا مختصر انتخاب ”خاموش دل“ کے عنوان سے ادبی ٹرسٹ حیدر آباد نے سن ۱۹۷۳ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں نظمیں بھی ہیں، اور غزلیں بھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ

ان کا کام زندہ رہنے کا سختی ہے۔ مگر حیات و فاعلیت، تو وہ یقیناً اور بھی ترقی کرتے۔

وفات کے بارے میں دو بیان ہیں پہلو یہ کہ وہ شب بھر نہیں پیتے رہے ۲۴/۱ نومبر ۱۹۷۲ء
علی الصباح نئے میں چور مکان واپس آ رہے تھے کہ گھر کے قریب گئے اور جان بحق ہو گئے۔
دوسرا بیان یہ ہے کہ ۲۴/۱ نومبر ۱۹۷۲ء علی الصباح وہ گھر سے سیر کر باہر نکلے۔ خٹوڑی ہی
مدر گئے تھے کہ قلب پر شدید حملہ ہوا اور پیشتر اس کے کو کوئی مدد کو پہنچ سکے، جان بحق
ہو گئے۔ جنازہ اسی شام اٹھا اور اعزاء اور احباب کے جم غفیر نے انہیں درگاہ حضرت
عبداللہ شاہ صاحب کے احاطے کا مانی پور وودودہ باولی میں سپرد خاک کر دیا۔
اولاد چھبانی میں چار لڑکے اور ایک بیٹی اپنی یادگار چھوڑی۔

یہ احتیاط کا عالم بھی کیا قیامت ہے پکار بھی نہ سکے، تھک کر تیرے نام سے ہم
نہیں نصیب میں فوج و بحر، تو خم بھی نہیں مگر سپرائی کی صورت بچے میں شام سے ہم

محفل کی حد تک، ہوتی ہے بات چرائی محفل کی
اور سپرائی راہ کے چرچے منزل منزل ہوتے ہیں
کہ روہنے والوں سے، ہر خوشی کی حد قسم ہے
کوئی وہ نہیں سکتا خم سے بے خبر ہو کر
جب سے دل کی دھڑکن میں، درد ہو گیا شال
زندگی نظر آئی، اور معشر ہو کر

حرم کی، دیر کی راہوں سے ہو کے گزرا ہوں تری گل سے مٹکا آج تک گزر نہ سکا
حرم کی، دیر کی راہوں پہ چل تو سکتے ہیں مگر نصیب کہاں تیری رہ گذار اچھی !
ذہنی توفیق میں کو کتاب، اپنے ذمہ وصولی کی

وہ احماد بڑھتے بڑھتے دامن قاتل تک آ پہنچے

بعد فوروشیا شبستان خوب ہے، لیکن جراثیم رہ گذار کی روشنی کچھ اور ہوتی ہے
بجڑ گلستان گل کا تبسم دیکھنے والا گل دشت آفریدہ کی ہنسی کچھ اور ہوتی ہے
ہمارا دل بھی ہے اک قاتل خدا لے شیخ ! مگر یہ دل کسی دیوار و در کا نام نہیں

حرم سے، دیر سے کھدوائے تو ہیں منصوب یہ راستے تو تری رہگذر کا نام نہیں
 مقامِ دوست سے آگے ہے منزلِ غمِ دوست مقامِ دوست ہی ختمِ سفر کا نام نہیں
 راہوں کی دفاویزی اکثر جہورِ سفر کر دیتی ہے
 منزل پہ پہنچ کر بھی کتنے آسودہ منزل ہونہ سکے

اشاریہ

۱۔ اشخاص

اکسی ہندسے کے نیچے لکھ کر یہ مراد ہے کہ اس صفحے پر یہ نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔

آرود، مختار الدین احمد ۹۷۱ حسن مارہروی، علی حسن : ۲۳۰، ۱۱۸، ۱۴۱، ۱۴۲

آغا محمد شرف، دیکھئے شرف آغا محمد احمد (عرب) ۲۴۰۶

آفتاب احمد، جہڑا دیکھئے جہڑا آفتاب احمد احمد بخش، ابرہہ سنی : دیکھئے ابرہہ سنی گوتری

آمنہ خاتون، عدالت، دیکھئے عدالت احمد حسن شوکت میرٹھی، دیکھئے شوکت میرٹھی

آمنہ خاتون احمد زاہد (سید) ۲۲۰

احمد علی ۱۸۱۱

احمد طاہر ۸۳۱ ابرہہ سنی گوتری، محمد بخش ۲۱۹۱

اختر حیدر آبادی، سرزار بیگم : ۱۹۹، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۱۹، ۲۱۸

اختر شیرانی ۳۴۰ ابو جعفر ضوی ۱۰۰، ۹۹، ۱

ارغنی حسین عابدی ۲۲۰ ابو محمد حبش، دیکھئے حبش، ابو محمد

ارغیاد علی کیف محمود آبادی، دیکھئے انیم فیروز آبادی، امیر احمد ۴۲۰

کیف محمود آبادی ۲۵۱، ۲۴۱، ۲۳۰

ارشاد نقانوی ۱۷۱ اقتشام حسین، پروانہ سر ۱۹۹۱

ارشاد حسین ۱۰۵۱ ۱۰۱، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴

امیر سعادت، جمال الدین ۳۵۰ احسان دانش ۲۴۱

۹۳ :	آنند ریاس	۱۹۰ :	اشپرننگ
۱۰۰ :	انصار حسین	۹۴ :	انصر حسین (سید)
۴۴ :	انوار حسین (حکیم)		انظر احمد کانی، دیکھے کانی، انظر احمد
۲۲۶ :	انور (پسر سلام)	۱۰۴۱ :	انوار حسین، پسر سر سید
۸۱ :	ایمرن، ہرہوٹ، الفشت، گورنر :	۵۲ :	انوار صدیقی
			انصر حسین، انصر گوردی، دیکھے انصر گوردی
۱۹۰۱۷۹ :	باقی محمد	۲۸۱ :	انصر گوردی، انصر حسین
۴۰ :	باقی صدیقی، محمد افضل	۹۱ :	افضل، ام، خواجہ
۷۴ :	بابو، سلطان	۱۹ :	اقبال (ملازم)
۲۰۱ :	بکر و محبوب (راجا محمد امیر احمد خان) :		اقبال احمد خان، پہل، دیکھے سہیل
۲۰۵، ۲۰۲ :		۱۰۰ :	اقتدار حسین
۶۸ :	برتر، نادری علی	۱۹ :	اکرام علی صفوی
۱۱۱، ۳۴۱ :	بشیر احمد، سیال	۵۱ :	الم مظفر ٹکری
	بشیر محمد آبادی، بشیر النساء بیگم، ۱۹۰۱۷۹ :		اقباز علی تاج، دیکھے تاج، اقباز علی
	بشیر النساء بیگم، دیکھے بشیر محمد آبادی		احمد حسین، احمد، دیکھے احمد محمد آبادی
۵۸ :	بشیرہ (زوجہ ظفر)	۱۹۴ :	احمد محمد آبادی، احمد حسین
۲۰۱ :	بگٹ، عظیم آبادی، غلام دستگیر خان، ۲۰۱ :	۴۲ :	امیر بیانی
	بلقیس جمال، دیکھے جمال و جمیلہ		امیر احمد اٹیم، دیکھے اٹیم خیر آبادی
	ہتے سہائی، دیکھے سجاد ظہیر	۱۹۸ :	ایمر حسن، سید
۱۹۰ :	بوٹرو		امیر محمد خان (مہاراج کمار محمود آباد)
۲۰۲ :	بہادر شاہ	۲۰۲ :	
۱۹۴ :	بھائیگما (ہنت جذب)	۱۸۸۱، ۷۲۰، ۷۹ :	ایمر خسرو
۱۹۴ :	بہادر الدین قادری	۲۲۶ :	انجم (پسر سلام)

بہرہ علی صلی، دیکھیے صفی اورنگ آبادی قرآن عادی پھولاری حیات الحق : ۱۹۱

۹۳، ۹۲

۴۳: تحفہ ۱۸۲: پرنس و سبین گپتا

۲۱۴: ہمدرد شاہی

۸۵: نیوٹر ۲۳۶: پروین (ہفتہ سلام)

۱۹۴: ہر بار داؤد (پسر جذب)

۱۰۵: ثریا (ہفتہ اشتام حسین) ۱۰۱: ہریم چند

۷۷: پنہاں بریلوی، سپہر آرا خانوں

جافریسن، دیکھیے جعفر حسن

۱۷۷: جاوید (پسر عادل) ۲۳۱: سب حیدر آبادی، احمد الدین احمد

۱۹۴، ۱۹۳: جذب عالمپوری، رائے گوندہ راؤ ۲۱۹، ۲۱۸: تاجش، طریقت حسین

۱۰۵: جعفر اقبال (پسر اشتام حسین) ۱۸۲: تاثیر، محمد دین

۱۷۱: جعفر حسن (جافریسن) ۱۹۲: تاج، امتیاز علی

۱۰۵: جعفر حیات (پسر اشتام حسین) ۹۹، ۹۸: تاج، تریشی، محمد تاج الدین

۱۰۵: جعفر مسکری (") ۱۹۴: تاج، محمد فانی

۱۹۴: جنگ بریلوی تبسم، غلامی، مصطفیٰ، صوبائی

۷۷: جمال و جمیلہ، بقیس جمال ۹۱: تپان، نور الحق

جمال الدین، اسیر انصاری، دیکھیے اسیر انصاری ۱۸۵، ۱۸۴: حرمین زارہ

۲۱۴: جمیل منظری ۱۹۴: ترکی، غلام محمد

۲۰۲: جناح، محمد علی ۲۳۶: تزیین (ہفتہ سلام)

جواہر فال ہرود، دیکھیے ہرود، جواہر فال تسلیم (ہفتہ عادل)

۱۸۱: جوائس نقی حسن دانا، دیکھیے دانا، حق حسن

۳۳، ۳۲: جوش ملیح آبادی ۱۷۱: حسن داس

۱۹۵، ۱۹۴ : ۲۰۳	حیدرآبادی، عبدالحمد	۲۰۳	بوشی، بی سی
۸۲۰	حیدرآبادی (دانی بھائی)	۱۷۰	جوہر آفتاب احمد
۱۹۴	حیات، الحق محمدی الدین، دلچسپ تہذیبی	۱۹۴	جے دیوی
۱۸۲	حیدر شاہ، حیدر، دلچسپ حیدر، حیدر شاہ	۱۸۲	جوتی گوشت
۲۳۰	حیدر شاہ، حیدر شاہ		
	خلیل احمد شمیم، دلچسپ شمیم، خلیل احمد		
		۱۹۸	جراغ علی (اعظم دار جنگ)
			جراغ حسن، حسرت، جراغ حسن
۱۹۸، ۱۹۷	داغ	۹۵	حافظ
۲۰۱	داؤد خان	۱۸۰	حالی
۱۱۱	دین محمد، شیخ	۲۰۲	حبیب اللہ، ڈپٹی
		۹۵	حزین
۲۰۵	ڈیوٹ، مبارک حسین، مسٹر	۱۱۲	حسرت، جراغ حسن
			حسن آرا بیگم، دلچسپ غزالہ
۲۳	ڈاکٹر حسین، ڈاکٹر	۱۸۹، ۱۷۹	حسن ظہیر
۲۰۴	ذکی عبد القادر	۱۰۱	حسن سکری، میر
۶۸	ذوق	۱۸۰	حسن نظامی
		۵۲	حسین احمد مدنی
۲۲۶	راہبہ خاتون (زوجہ سلام)	۲۸۰	حسین اصغر
۱۹۴	راجا (بنت جذب)	۱۸۹، ۱۷۹	حسین ظہیر
۹۲	راجندر پرشاد (بابو)	۲۱۸	حشر، حسن علی
	راہل ہوشیار پوری، عبد الرشید		حفیظ ہوشیار پوری، عبد الحفیظ سلیم
۱۸۶	راہکار شفیق، صدر جمہوریہ	۱۸۲، ۱۷۹	

راؤ سہسوانی	۲۱۷۰۳۱۷۱	بیگانہ اللہ خان گورکھپوری	۳۳۰، ۳۳۱
راشد علی صفوی	۱۹	سکینین : ناصر الدین	۳۲
رام راؤ، چندت	۱۹۳	سجاد عبیر : سید	۱۷۹، ۱۸۰، ۱۷۹، ۱۷۹
رام نرسن چندت	۱۹۳	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رحیم (خانخانان)	۱۷۱	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رششان، مطیع احمد	۱۷۰	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رشید جہاں	۱۷۱	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رضا حسین، سید	۱۷۹	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رضی، رضیع احمد	۱۷۰	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رضی احمد، رضی : دیکھئے رضی، رضی احمد		سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رضیہ خانو	۸۸	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رضیہ سجاد ظہیر	۱۷۹	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رضیع احمد عالی : دیکھئے عالی، رضیع احمد		سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رنگین، ہری ہریت سنگھ	۳۳	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
رویں دولان	۱۰۷	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
ریاض خیر آبادی	۳۳، ۳۳	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
زادہ النساء بیگم	۱۰۰	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
زور، محی الدین قادری	۷۹، ۱۱۹	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
زید، اے۔ احمد (نرسن عابدین احمد)	۱۷۴	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
زیرک، علی احمد	۷۸	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
زین عابدین سجاد (نام)	۳۲	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹
زینبہ عبدالقادر (مسز)	۵۷	سجاد علی	۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹، ۱۷۹

۲۳۱	صبا، سرور خان	۲۳۲	سید سلیمان ندوی
۲۱۸۶	صغیر حسن مظفر ٹکری	۸۴، ۸۵	سید طاہر حسین (ڈاکٹر)
۷۷۱	صغیر علی موٹی	۲۱۹ + ۷۴، ۵۸، ۵۱	صبا، ابوبکر آبادی
۲۳۰۱	صفی اورنگ آبادی، بیہودہ علی		
۱۳۳۱	صغیر، وارث ناصر	۹۴۱	شاہ بلال قی خانقاہ
		۱۷۱	شاہیدہ تنویر (بنت عادل)
۱۹۱	ضامن علی صفوی غازی	۹۴، ۹۵، ۲۳	شہل نعمانی
	ضیا احمد ضیا بدایونی، دیکھیے ضیا بدایونی،	۲۰۵۱	شرف، آغا جتو
	ضیا احمد	۸۴۱	شرف الدین شاہ ولایت
۲۱۷۱، ۱۷۱، ۱۷۱	ضیا بدایونی، ضیا احمد		شفیع احمد، دیکھیے شفیق احمد
۲۲۱	ضیا اللہ	۱۸۱	شمس النساء بیگم
		۹۵۱	شمس الدین، عبدالعزیز
۷۷۱	طالب الزآبادی، طالب علی	۳۳۱	شمیم، فیصل احمد
	طالب علی طالب الزآبادی، دیکھیے	۱۰۱	شمیم کرمانی
	طالب الزآبادی	۱۷۱	شوکت سخاوی
۸۷۱	طاہر کلثوم	۱۹۲	شوکت بیگم، احمد حسن
	طریقت حسین، تابش، دیکھیے تابش طریقت حسین	۱۷۳	سلیح رسول
۲۳۱	ظفر محمد یوسف (یوسف ظفر)	۱۷۵، ۱۷۳	شیخ علی
۵۷۱	ظفر، سراج الدین ظفر	۲۲۴	شیریں (بنت سلام)
	ظفر بہدی گہر، دیکھیے گہر ظفر بہدی		
۷۸۱	ظہیر دہلوی، ثواب مرزا		صادق حسین بنار، دیکھیے بنار صادق حسین
۱۷۲	ظہیر احمد صدیقی	۱۸۱	صادق علی بیگ
			صالحہ بیگم، دیکھیے معنی، صالحہ بیگم

عبدالعزیز (پیر سر)	۱۷۹۰	غیر سن
عبدالحکیم (ڈاکٹر)	۱۰۳۶	
عبدالحفی (خان صاحب)	۱۹۹۱/۱۹۸۰	عادل رشید
عبدالحکیم خان	۲۱۴۶	مارنہ خیر آبادی، شاہ احمد غاروی
عبدالحمد	۱۱۱۰/۱۱۰۶	عارف ابوالصلی
عبدالمقتدر، مولانا	۱۷۱۶	حالی، رنج احمد
عبدالصاحب، ابو ظفر	۱۹	حائث (زوجہ حمید ناگپوری)
عبدالقادر احمد تابہ، دیکھے	۲۱۹۶	حائث سنگ (زوجہ ابرا)
صاب محمد آبادی عبد القادر احمد	۸۷۱	عباس بھائی
عثمان غنی (منا)	۱۹۹۶	عبدالاحد بریلوی
عدم، عبدالحمد	۴۰۶	عبدالاحد شمشاد، دیکھے شمشاد کنھوی، عبدالاحد
عزیز ایگم (بیگم عادل)	۱۷	عبدالحفیظ حکیم، حفیظ، دیکھے حفیظ، بریلوی
عزیزی اوسری، محمد حسین حکیم	۲۱۳۱/۲	عبدالحق (مردی، ڈاکٹر)
عزیز کنھوی	۲۰۳۶	عبدالحکیم گزری (حکیم)
عزیز القاطرہ (بنت نمتا)	۹۴	عبدالحمد، عبدالحمد ناگپوری، دیکھے حمید ناگپوری
عسکری حسن	۸۴	عبدالحمد عدم، دیکھے عدم، عبدالحمد
عظیم اختر (پسٹیم اختر)	۵۱	عبدالحی
عقمت بدایونی، آمنہ خاتون	۷۷	عبدالرحمن
علی، سید	۴۲	عبدالرشید راحل، دیکھے راحل، بریلوی
علی الحسن، حسن، دیکھے حسن، بریلوی		عبدالرشید
علی حسن		عبدالستار صدیقی
علی احمد زریک، دیکھے زریک، خوچی		عبدالسلام سلام، دیکھے سلام، بھل شہری
علی احمد		عبدالسلام

۸۸ :	فاطمہ فرخ	۱۸۸ :	علی باقر
۲۸ :	فانی		علی سید نظم طباطبائی، دیچکے نظم طباطبائی،
۹۳/۹۱ :	فائز، نذیرالحی		علی سید
۹۳ :	فائق، محمد امام الدین	۵۰ :	علیم اختر مظفر نوری
۱۶۱ :	غفر الحامیہ	۱۸۹/۱۷۹ :	علی خیر
۹۲ :	غفر الدین (سر)	۹۲ :	علی علی الدین
۱۰۱ :	فدا حسین، میر	۹۶/۹۱ :	عماد الدین تھکندر
۱۸۱ :	فرائد	۱۹۸ :	عزیزت اللہ خان مشرقی
۱۱۰ :	فضل محمد خان	۱۰۰ :	عیش لکھنوی، ابو محمد
۵۷ :	نقیر محمد، مولوی		
۲۰۲ :	فیاض حسین کنتوری	۱۸ :	خبار، صادق حسین
۵۸ :	فیروز دین (مولوی)	۷۷ :	خزالدہ بریلوی، حسن آرازم
۸۲ :	فیروز شاہ قلی		غلام دستگیر خان بٹ، دیچکے
۱۸۶/۱۸۵/۳۴ :	فیض، فیض احمد		بخت، علیم آبادی، غلام دستگیر خان
	فیض احمد فیض، دیچکے فیض، فیض احمد	۳۳ :	غلام رسول
		۱۱۰ :	غلام محمد، شیخ
۳۶ :	غلامی خیر آبادی		غلام محمد (ترک علی شاہ)، دیچکے ترکی،
۱۸۵ :	قربان علی خان		غلام محمد
۱۹۸ :	قرن لکھنوی، کریم حسن		غلام مصطفیٰ نمونی تبسم، دیچکے تبسم،
			غلام مصطفیٰ نمونی
۱۰۱ :	کافعی بانو (زوجہ شمیم کرمانی)	۴۲ :	نملین، محمد مہدی
۱۶۱ :	کبیر	۲۱۹ :	ضنی باقر دپسرا
		۸۴ :	فیاض الدین بلبن

۲۲۴۶	تین بھلی بڑھری	۱۸۶	کشن پرشاد (ہارابا)
۱۰۴ :	مروج سلطان پوری		کریم حسن قمر : دیکھے قمر لکھنوی ،
۹۲۱۹۱ :	حبیب اللہ قادری		کریم حسن
۱۷۱ :	محب اللہ	۱۷۱ :	کمال احمد
۱۹۹ :	حبیب علی	۱۷۲ :	کمالی ، ظہر احمد
۱۷۵۰	محمد ابراہیم (پسر حمید)	۲۰۵۱	کیف محمد آبادی ارشاد علی
۸۱ :	محمد ابراہیم ، حاجی	۱۰۴ :	کیفی جملی
۱۷۱ :	محمد ابراہیم قادری		
۲۲۶ :	محمد احمد بخش	۱۷۲ : ۱۷۱ :	گاندھی ، ہاتھ
۸۳ :	محمد احمد ، شیخ	۱۷ :	گاندھی (پسر عادل)
۲۴ :	محمد اسحاق ، شیخ	۱۹۰ :	گل کرست
۸۳ ، ۸۱ ، ۸۰ :	محمد اسماعیل پانی پتی	۲۲ :	گوہر تاج
۲۲۴ :	محمد اسماعیل جوہری	۲۰۳ :	گہر ، ظفر ہمدی
۱۸۶ ، ۱۸۵ :	محمد اختر جوہری		
	محمد افضل باقی صدیقی : دیکھے باقی صدیقی	۱۸۱ :	لارنس ، ڈی ، ایچ
	محمد امام الدین فائق : دیکھے فائق ،	۶۳ :	لٹ سن
	محمد امام الدین	۱۰۰ :	لختہ حسین
	محمد امیر احمد خان (دالی محمد و آبا)	۷۴ :	بن یوتاگ
	دیکھے بکر محبوب		
۶۸ :	محمد امیر الدین قریشی	۱۹۳ :	ادھواڑ ، ہندت
۲۰ :	محمد امیر حسن (راجا محمد و آبا)		ہدارک حسین ٹویٹ : دیکھے ٹویٹ
۲۰۵		۹۲ :	ہدارک فاطمہ
۹۳ ، ۹۲ :	محمد انعام الدین (پسر مرزا)	۸۳ :	ہدارک محمد ، شیخ

محمد یوسف، ابی بکر	۲۰۱۰۱۷۰۱	محمد یوسف، یوسف ظفر: دیکھیے
محمد تخلق	۲۰۱۰	یوسف ظفر، محمد یوسف
محمد تقی (خان بہادر)	۸۷۰	محمدی جان
محمد جعفر بھلوار دی	۹۵۰	عمور و انظر
محمد حسین عرشی: دیکھیے عرشی، محمد حسین		عمور و خان
محمد حسین عطا	۱۸۵۰	عمور و غزنی
محمد خواجہ شفیع حسن عارف (ابوالعلائی):		محمد الدین قادری زور: دیکھیے زور
دیکھیے عارف، ابوالعلائی		محمد الدین قادری
محمد دین تاثیر: دیکھیے تاثیر، محمد دین		محمد الدین مختار صدیقی: دیکھیے
محمد زہیر (پسر عبدالستار صدیقی):	۷۵۰	محمد عبدالستار صدیقی
محمد سلطان	۲۸۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد عالم، حافظ	۸۲۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد عبدالرزاق	۲۲۴۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد عبدالعلیم صدیقی: دیکھیے علیم اختر		محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
مظفر نگر		محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد عبدالقادر	۵۷۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد علی وسم نیر آبادی: دیکھیے وسم نیر آبادی		محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد علی جناح: دیکھیے جناح، محمد علی		محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد علی محمد خان (درویش محمد آبادی):	۱۰۲۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
۲۰۵۰۲۰۲		محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد قاسم حسین	۱۰۰۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد مسلم (پسر عبدالستار صدیقی):	۷۵۰	محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے
محمد مہدی غلین: دیکھیے غلین، محمد مہدی		محمد عبدالستار صدیقی: دیکھیے

نذیر الحق فائز، دیگھے فائز، نذیر الحق	مناذ علی سید شمس العلماء : ۱۱۵
۲۱۹ : نرہت حسین (پسر ابر)	۱۴۲ : منظور حسین وکیل
۲۲۹ : نسreen (بنت سلام)	۹۴ : سہاج الدین خندوم جیلانی
۱۷ : نسرین (بنت عادل)	۴۲ : ہر علی شاہ کھنڈر
۱۸۹ : نسیم (بنت سجاد ظہیر)	۱۰۶ : سدرائیک
۱۸۵ : نسیم بیگم	۲۰۳ : سونے بن جعفر (۱۸۱)
۳۰۱ : نعمتہ (شیخ نشین)	۷۴، ۲۹۰، ۲۸۱ : میر
۳۰۱ : نعمتہ، تاحی	۱۶۱ : میرا بائی
۱۸ : نغمہ لمبا بائی، علی حیدر، مسید	۷۴، ۲۴۰ : میراجی
نظیر حسن سخا دلوی، دیگھے سخا دلوی	۸۴ : میراں سید علی بزرگ
۹۵ : نظیری	
۳۰۵ : نفیس لکھنوی	۲۳۱ : نادر شاہ
نواب ہندی، نواب خان الہ آبادی : ۱۶۶	نادر علی برتر، دیگھے برتر، نادر علی
نواب خان نواب ہندی : دیگھے	۱۸۹ : نادرہ (بنت سجاد ظہیر)
نواب ہندی	نامرخصا نامرکالنی : دیگھے نامرکالنی،
نواب علی خان (راجا) : ۲۰۵، ۲۰۱	نامرخصا
نواب مرزا ظہیر دہلی : دیگھے ظہیر دہلی	نامرکالنی، نامرخصا : ۲۸۱
نواب مرزا	ناطق گلاؤٹھوی، ابراہیم : ۱۶۶
نور (بنت سجاد ظہیر) : ۱۸۹	نجی بخش : ۲۱۶
۹۲ : نور، نور احمد	نثار احمد نارتھی حارث : دیگھے
نور احمد نور، دیگھے نور، نور احمد	حارث ظہیر آبادی، نثار احمد نارتھی
نور الحق تپاں، دیگھے تپاں، نور الحق	نجم الحسی رضوی : ۳۵
نولڈیک	نجدہ (بنت سجاد ظہیر) : ۱۸۹، ۱۸۸

۱۴۳ :	دانا، قلی حسن	۱۸۷۱، ۱۸۳۶	خبر درخواہر لال
۹۴ :	ولیت (ہنتہ تہا)	۲۳۰ :	نیا زنجپوری
۱۰۱ :	ہاشمی بالو (زودہ اشتام حسین)		دارث فاطمہ، دیکھیے صنوبر سیتا پوری
	ہری ہر دت سنگھ رنگین، دیکھیے رنگین	۱۰۰ :	وہابیت حسین
۶۳ :	ہورودیش، جوزف	۱۷۰ :	وحید الدین
۱۸۱ :	ہیرس، فرانک		وحید الدین سلیم پانی پتی، دیکھیے
			سلیم پانی پتی، وحید الدین
۲۲۹ :	یاسین (ہنت سلام)	۸۷ :	وحید الدین احمد
۲۳۰، ۲۲ :	یحییٰ اعظمی	۲۱۹ :	ولیت حسین (پسر ابر)
۴۶ :	یقین احمد (پسر ایشم)	۱۸۱، ۱۸۰، ۱۷۹ :	وزیر حسن (سر)
۳۳ :	یوسف ظفر، محمد یوسف	۲۰۲، ۱۸۴، ۱۸۳، ۱۸۲ :	
۱۷۱ :	یونس علی محدث، سید		وسیم خیر آبادی، محمد مسکری : ۴۲، ۴۳، ۴۴
		۴۶ :	وہی سیتا پوری

۲ مطبوعات (مکتب رسائل)

۹۴ :	اصلاحِ سخن (شرق)	۱۹ :	آجیگزہ شعر البشر
۱۴۲ :	اطلاقِ سماجیات (جعفر حسن)	۱۹۵ :	آجیگزہ جذب (جذب)
۱۰۶ :	اعتبارِ نظر (اعتماد حسین)	۵۸ :	آئینہ (ظفر)
۹۶ :	اقبالِ مرگبہ (نصرت)	۱۶۲ :	ابتدائی قمرانیات (جعفر حسن)
۸۲ :	افکارِ سلیم (سلیم)	۱۹۵ :	احساساتِ جذب (جذب)
۱۰۶ :	افکارِ رسائل (اعتماد حسین)	۲۱۸ :	اصول (ہنامہ)
۱۷ :	استبجاء (ماہنامہ)	۱۰۵ :	ارپ اور سماج (اعتماد حسین)
۴۶ :	امیر اللغات (امیر میثاقی)	۱۱۲ :	ادبی دنیا (ماہنامہ)
۱۰۶ :	انتخابِ آبِ حیات (اعتماد حسین)	۶۶ :	اردو (تھاپی)
۱۸۱ :	انکارسے (سجاد ظہیر)	۲۳۰ :	اردو (ہفتہ وار)
۵۱ :	انوارِ حرم (علیم اختر)	۱۶۱ :	اردو ساجتیکہ کا اتھاس (اعتماد حسین)
۲۸ :	اوراقِ نو	۱۰۶ : (۱۰۶) :	اردو ساجتیکہ کا آئینہ نمک اتھاس
۹۶ :	ایضاحِ سخن (نصرت)	۱۹۵ :	ارمغانِ جذب (جذب)
۲۲۶ :	بازو بند کھل کھل جائے (سلام)	۷۹ :	اشکِ خوئیں (پنہاں)
۲۹ :	برگِ نئے (ناصر کاظمی)	۲۲۰ :	اصلاحِ الاملا (ابر)

۱۰۶	جوشِ اندازِ کافی (اعتماد حسین):	۵۱	۱	ہونے لگی (عظیم اختر)
۴۵۱	جھنگ (ماہنامہ)	۳۳۵	۱	پائل (سلام)
۷۴	جینے کی اہمیت (میں یوتا نگ):	۱۹۳	۱	پردانہ (ماہنامہ)
۵۷۱	صدائق الخفیدہ (فقیر محمد)	۱۸۷	۱	پیشکشِ نیک (سجاد ظہیر)
۱۴۶	حرفِ غاموش (حمید)	۲۹	۱	پہلی بارش (نامہ نگار کاظمی)
۱۸۷	حیات (ہفتہ وار)	۱۱۲	۱۱۱۱	پھول (ہفتہ وار)
۸۲	حیاتِ نو (ماہنامہ)	۵۱	۱	پھول پتے (عظیم اختر)
۲۳۱	خاموشی (ماہ)	۸۴	۱	تاریخِ اصغری (اصغر)
۲۲۰	خزینے (ابر)	۶۹	۱	تاریخِ دوکن (منظوم)
۱۸۷	خطوطِ زمیں (سجاد ظہیر)	۱۷۳	۱	تجلیات (ضیاء)
۱۹۵	خفاۓ نگین (جذب)	۱۹۵	۱	تحفہ جذب (جذب)
۲۱۹	دستورِ اصلاح (سیلاب)	۴۴، ۴۳	۱	تحفہ خوشتر (ماہنامہ)
۲۹	دیوان (نامہ نگار کاظمی)	۱۷۳	۱	تذکارِ سلف (ضیاء)
۶۷	دیوانِ بیان (بیان)	۸۲	۱	تذکرۃِ عالی (محمد اسماعیل)
۹۱	دیوانِ قائم (قائم)	۱۹۹	۱	تضمینِ اقبال (اختر)
۱۷۳	دیوانِ مومن مع شرح (ضیاء)	۱۰۵	۱	تنقید اور عملِ تنقید (اعتماد حسین):
۱۰۵	ذوقِ ادب اور شعور (اعتماد حسین):	۱۰۵	۱	تنقیدی جائزے ()
۵۷	راہِ مسر (عبد القادر)	۱۰۶	۱	تنقیدی نظریات ()
۴۰	راہِ منزل (ہفتہ وار)	۱۱۲	۱	تہذیبِ فصول (ماہنامہ)
۱۹۵	رباعیاتِ جذب (جذب)	۸۱	۱	جامِ جہاں نما (ماہنامہ)
۹۶	رسالہ تذکرہ و تائید (تمنا)	۸۸	۱	جذباتِ صنفی (مخفی)
۱۰۵	روایت و بقاوت (اعتماد حسین):	۱۷۳	۱	جلوۃ حقیقت (ضیاء)
۱۸۷	روشنائی (سجاد ظہیر)	۵۸	۱	جنت ایکسپریس (ظفر)

۱۰۶	کس اور آپیٹے (اقتشام حسین)	۱۰۶	روشنی کے درپے (اقتشام حسین)
۱۴۲	عمرانیات اور سلاطین (جعفر حسن)	۲۸۱/۲۱۹۱	وہائے تعلیم (ماہنامہ)
۱۸۷	عوامی دور (ہفتہ وار)	۱۴۲	زمین انقلاب ہند سماجیات (جعفر حسن)
۵۸	غزال غزل (ظفر)	۵۸	زمین حیات (ظفر)
	قالب اور انیس: ایک تقابلی مقابلہ	۱۸۹	زندہ نامہ (فیض)
۱۴۲	(جعفر حسن)	۱۰۵۱۰۳	سائل اور معتمد (اقتشام حسین)
۱۷۳	تھامس مومن مع شرح (ضیا)	۱۹۵	ساز و غزل (جذب)
۱۷۳	قولی سدید (ضیا)	۱۸	ساقی (ماہنامہ)
۱۸۹	قوی جنگ (ہفتہ وار): ۱۸۳، ۱۸۹	۵۷	سراج الاخبار
۲۳	کابل (ماہنامہ)	۱۷۶	سفر نامہ روس (اقتشام حسین)
۳۵	کارواں (ماہنامہ)	۲۲۰	سفینے (ابر)
۱۴۲	کارنامہ انیس (جعفر حسن)	۱۷۳	سن زار (ضیا)
۸۱	کائنات (ماہنامہ)	۹۶	سیدھا سستا (مراء مستقیم)
۹۶	کربل کشتا (فعلی)	۵۱	شبستان (ماہنامہ)
۱۰۶	کھلی (اقتشام حسین)	۲۲۰	شبیخے (ابر)
۳۴/۳۳	کلیں (ماہنامہ)	۱۹۴	شعر ہند (ماہنامہ)
	کیا موجودہ تصوف خالص اسلامی ہے؟	۵۱	شمس (ماہنامہ)
۱۷۳	(ضیا)	۱۹۹	صیفہ و دشان (اختر)
۵۱	گل بوئے (علیم اختر)	۵۷	صدائے جرس (مسز عبدالقادر)
۴۳	گلچیں (ملاسٹہ)	۸۲	حائیکیر (ماہنامہ)
۱۰۶	گلچیں کی کہانی (اقتشام حسین)	۸۸	عسرت (ہفتہ وار)
۵۷	لاشوں کا شہر (مسز عبدالقادر)	۸۱	عسرت (ماہنامہ)
۱۷۳/۱۷۰	لغات (رضی)	۸۱	عروج (ہفتہ وار)

۵۱ :	نہجت علی (عظیم اختر)	۱۸۱ :	لذت کی ایک بات (سجاد ظہیر)
۲۲۰ :	انکار (ماہنامہ)	۸۰۱ :	نوریاں اور سیلیاں (محمد اسماعیل)
۲۲۰ :	نیگینے (ابر)	۱۷۳ :	مباحث و مسائل (ضیاء)
۸۵ :	نیک پارے (سید فتحی حسن)	۹۶ :	مذہب و عقل (تنقہ)
۱۱۲ :	نیکو ان (ہفتہ وار)	۱۷۳ :	مسائل و منازل (ضیاء)
۲۳ :	نورانی حیات (بکچی عظمیٰ)	۸۱ :	مشعل (ماہنامہ)
۲۳ :	نوائے عصر ()	۲۲۵ :	مغرب (ماہنامہ)
۴۲۰ :	نوراللقاات	۲۳ :	معارف (ماہنامہ)
۸۵۱ :	نئی روشنی (ہفتہ وار)	۹۶ :	معاش و معاشرہ (تنقہ)
۸۸۱ :	نیماشاہکار (مغنی)	۱۹۵ :	مطوبات جذب (جذب)
۵۷ :	وارثیات (مسز عبدالقادر)	۸۲۱ :	مطالات سرسید (محمد اسماعیل)
۲۲۵ :	دوستیں (سلام)	۸۲۱ :	مکاتیب عالی
۱۰۶ :	دو کاندہ (احتشام حسین)	۱۷۳ :	مکتوبات (ضیاء)
۱۰۵ :	دیر رائے (احتشام حسین)	۸۲۱ :	مکتوبات سرسید (محمد اسماعیل)
۱۶۲ :	ہماری ریلیں اور شریکیں (جعفر حسن)	۱۶۱ :	نہجیات ہندی کلام
۱۱۱ : ۲۸۱ :	ہمایوں (ماہنامہ)	۷۳ :	خزل شب (مختار)
۵۸ :	ہندستانی قہار (ابر)	۲۲۰ :	میری اصلاحیں (ابر)
۱۶۲ : ۱۶۲ :	ہندستانی سماجیات (جعفر حسن)	۲۲۵ :	میرے نغمے (سلام)
۱۸۷ :	ہندی، ہندستانی استبداد (ظہیر)	۶۷ :	نامہ غالب
۱۷۳ :	یادگار عالی (عالی)	۱۸ :	نارید (ماہنامہ)
		۲۲۲ :	نفس (ماہنامہ)

کتابخانہ : جامعہ اسلامیہ کراچی

۲۸ فروری ۱۹۷۶ء

سچی بے گرامی



مصنف: رشید احمد صدیقی

صفحات: 288

قیمت: 78/- روپے

اللہ مشکوٰۃ



مصنف: رشید احمد صدیقی

صفحات: 216

قیمت: 65/- روپے

اولیٰ حاجیات



مصنف: محمد حسن

صفحات: 96

قیمت: 50/- روپے

انکار و دی



مصنف: محمد عبدالسلام خاں

صفحات: 348

قیمت: 110/- روپے

انکار و قبول



مصنف: محمد عبدالسلام

صفحات: 388

قیمت: 120/- روپے

وسکان کی تعلیم و تربیت



مصنف: محمد اکرام خاں

صفحات: 124

قیمت: 56/- روپے

اقبال اور دی



مصنف: حمید الحقوی دشوی

صفحات: 152

قیمت: 63/- روپے

مسلمانوں کا تعلیمی نظام



مصنف: شہداء الحسن فاروقی

صفحات: 88

قیمت: 48/- روپے

